بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریک ادب

شمارہ(100)اپریل-2026 جلد نمبر 19

Tahreek-e-adab vol-19, issue-100 April 2026

Editor **مدیر**

جاوید انور (ڈاکٹر جاوید احمد) **Jawed Anwar** (Dr.Jawed Ahmad)

cell-0091-9935957330

مجلس ادارت

Editorial board and Peer Review committee

پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبہء اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.

پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہء اردو، جموں یونیورسٹی

Prof.Shohab Inayat Malik HOD Urdu,Jammu University

ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہء عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)

پروفیسر محفوظہ جان، سابق صدر، شعبہء کشمیری، کشمیر یونیورسٹی

Prof. Mahfooza Jaan(Ex.H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)

پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہء اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)

Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)

ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہء اردو، مولانا آزاد پی۔جی۔کالج، کولکاتا

Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata

ڈاکٹر احسان حسن، شعبہء اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی

Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

نجمہ عثمان،،اشتیاق احمد،عرفان عارف،ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman (Surrey, United Kingdom)

Aslam Imadi (Hyderabad)

Ishtiyaq Ahmad (General Secretary, Sir syed society Varanasi)

Irfan Arif (H.O.D.Dept. of Urdu,GDC Reasi University of Jammu,

Dr. Mohd. Qasim Ansari (Asst. Prof. Drpt. of Urdu Banaras Hindu University, Varanasi)

Omar Farooq (Riding House,Kanpur)

Dr.Chaman Lal Bhagat (Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

سال اشاعت: Year of Publication 2026 Vol-19(جلدنمبر19)

شمارہ نمبر شمارہ 100۔اپریل ،2026 Issue-100 April

سرنامہ خطاط:انور جمال Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi

سرورق : Title cover Uzma Screen, Varanasiعظمیٰ اسکرین

فی شمارہ : 200/-Two Hundred rs. per copy دوسو روپے

زرسالانہ : دوہزار روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زر رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Jawed Ahmad IFSC SBIN0016812 A/C no. 33803738087

State Bank Of India, Branch- Lahartara

Varanasi-221103(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے نیہا پرنٹنگ پریس، وارانسی سے شائع کرار دو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from Neha Printing Press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

مضامین:

1۔جموں وکشمیر کا ایک اہم عصری رباعی گو شاعر:
فرید پربتی پروفیسر شہاب عنایت ملک 6
2۔اردو تدریس: ٹکنالوجی اور قومی تعلیمی پالسی
2020 کے تناظر میں ڈاکٹر طیبہ نازلی 18
3۔کتب خانہ ادارہء تحقیق مخطوطات
مشرقی، حیدرآباد الماس فاطمہ، ڈاکٹر محمد رضوان 26
4۔دربھنگہ کے پہلے صاحب دیوان شاعر
مولوی سید عبدالودود بسمل ڈاکٹر عبدالودود قاسمی 33
5۔اردو زبان اور جدید ٹیکنالوجی: مسائل، امکانات اور مستقبل
(ایک جامع تہذیبی، لسانی اور تکنیکی مطالعہ) حافظ محمد انوار مصطفیٰ 38
6۔ڈاکٹر اے۔پی۔جے۔عبدالکلام: خوابوں کا سوداگر اور انسانیت کا
علمبردار (ایک مفصل سوانحی، علمی اور فکری خاکہ) حافظ محمد انوار مصطفیٰ 43
7۔عصمت چغتائی کے افسانوں میں نسوانی شعور
اور مزاحمت نصرت شاہین 48
8۔آسنسول کے انڈر گریجوئٹ طلبہ کا اردو زبان کے تئیں
رویہ اور درپیش مسائل کا مطالعہ ڈاکٹر امین انصاری 59
9۔کشمیر میں فارسی شعر وادب اور خمسہ نویسی کا
ایک مختصر جائزہ مبین احمد، ڈاکٹر محمد رضوان 73
10۔تحقیق کا طریقہء کار ڈاکٹر ارم جہاں 88
11۔فیض احمد فیض کی شاعری میں انقلابی رجحان نصرت شاہین 108
12۔زبان سیکھنے میں ذہنی نقوش کا اسے عمال ڈاکٹر ندا شہاب 114
13۔جدید ڈراموں میں نفسیاتی عناصر ڈاکٹر محمد ریاض 124

نظمیں:

پروین شیر، چندر بھان خیال، ڈاکٹر شبنم عشائی، پرویز مظفر 132

غزلیں:

اسلم عمادی، احمد شناس، عمر فاروق، پون کمار 136
ذوالفقار نقوی، سہیل اقبال، عرفان عارف

مضامین:

1۔مولانا وحیدالدین خان: بصیرتوں کا علمبردار — مفتی ریاض احمد 143
2۔مولانا وحیدالدین خان کا منفرد فکری اور
عصری اسلوب: عہد حاضر میں — ڈاکٹر ضیاء الرحمن 161
3۔آزادی کے بعد جموں وکشمیر میں اردو ڈرامہ — محمد اقبال میر 184
4۔فراق کی شاعری میں ہندوستانی عناصر: ایک جائزہ — شبنم انصاری 190
5۔زبان کی آموزش کا سماجی لسانیاتی نقطہ نظر — امتیاز احمد 195
6۔ترنم ریاض کے ناول "برف آشنا پرندے"
کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ — طاہر احمد میر 209

☆☆☆

Jammu-o-Kashmir ka Ek Ahem Asri Rubai go Shair : Fareed Parbati by

Prof. Shohab Inayat Malik (HOD Urdu Jammu University, Jammu)

پروفیسر شہاب عنایت ملک (صدر شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی، جموں 9419181351

جمّوں وکشمیر کا ایک اہم عصری رباعی گو شاعر: فریدؔ پربتی

رباعی اُردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے۔ اِس کا فن نہایت ہی مشکل ہوتا ہے۔ بحر و اوزان سخت ہونے کی وجہ سے بعض ناقدین نے اِسے ''پُلِ سراط'' قرار دیا ہے۔ یہ محض صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہی نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ اپنے اندر مکمل فکری کائنات کو سمیٹتی ہے۔ گویا یہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا کام انجام دیتی ہے۔ رباعی گوئی میں رودکیؔ سمرقندی، مولانا رومیؔ، جامیؔ، شیخ سعدیؔ شیرازی، حافظؔ شیرازی، عمر خیامؔ، قلی قطبؔ شاہ، رنگینؔ، میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، حالیؔ، امجدؔ حیدر آبادی، ریاضؔ خیر آبادی، فراقؔ گورکھپوری، یگانہ چنگیزی، جوشؔ ملیح آبادی، علامہ نجم آفندیؔ، سیمابؔ اکبر آبادی کے بعد دور حاضر میں فریدؔ پربتی اور عباس رضا نیرؔ جیسے شعراء نے فنی باریکیوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اِس صنف کو ایک نیا وقار بخشا۔

جمّوں وکشمیر میں جن شعراء نے اِس فن میں طبع آزمائی کرنے کی کوشش کی اُن میں شہہؔ زور کاشمیری، شوریدہؔ کاشمیری، مسعود سامونؔ، حکیم منظورؔ، مظفر ایرجؔ، عرشؔ صہبائی اور فریدؔ پربتی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ اِن تمام شعراء میں فریدؔ پربتی وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے اِس صنف کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی۔ اُنھوں نے نہ صرف جموں وکشمیر میں بلکہ مُلکی سطح پر بھی اِس صنف کو اکیسویں صدی میں فروغ دینے میں ایک کلیدی کردار ادا کیا۔

فریدؔ پربتی کا اصل نام غلام نبی بٹ ہے، تاہم برف پوش پہاڑی علاقوں سے نسبت کی وجہ سے وہ ادبی حلقوں میں ''فرید پربتی'' کے نام سے معروف ہوئے۔ان کی پیدائش 4 اگست 1961ء کو سری نگر کے علاقے ''سنگین دروازہ حول'' میں ہوئی۔فرید پربتی نہایت با اخلاق، دیانت دار، سادہ طبیعت اور محنتی انسان تھے۔ان کی شخصیت میں شائستگی، معصومیت اور سادگی نمایاں تھی۔ وہ صوفیانہ خیالات کے حامل تھے اور اولیائے کرام سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔غیر معمولی ذہانت اور قوی حافظے کی وجہ سے اُن میں کسی بھی طرح کی ظاہری بناوٹ یا تصنع نام کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ اُن کی طبیعت خلوص اور سچائی کا ایسا مجسمہ تھی کہ ہر کوئی اُن کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ بہت کم عمر وہ 2011ء میں ہم سے جُدا ہو گئے۔

فریدؔ پربتی کا شمار نامور اُردو رباعی گو شعرا میں ہوتا ہے۔اِس صنف میں اُنھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔اُنھوں نے اُردو دُنیا کو بڑے کم عرصے میں سات معیاری شعری مجموعے دیے۔جن کے نام یوں ہیں۔

1۔ابر تر، 2 ۔ آبِ نیساں، 3۔اثبات، 4۔گفتگو چاند سے ،5۔ہزار امکان۔6۔فرید نامہ اور 7۔خبر تحیر۔آخر الذکر دو مجموعے خالص رباعیات پر مشتمل ہیں۔باقی مجموعوں میں بھی رباعیوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔شاعری کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے تحقیق اور تنقید کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔اُن کی اہم نثری تصانیف میں ''انتقاد و اصلاح''، ''مقدمہ صنف رباعی''، ''تنقیدِ رباعی''، ''داغ بحیثیت مثنوی نگار'' اور ''شہ زور کشمیری: شخص اور شاعر'' شامل ہیں۔فرید پربتی کی شاعری میں زندگی کے حقائق اور انسانی مسائل کا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔ان کی غزلوں اور رباعیوں میں اعلیٰ انسانی اقدار، سنجیدگی، متانت اور فکری وسعت کا خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔وہ اپنے خیالات اور احساسات کو نہایت سادہ مگر مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں اور اس عمل میں نہ انہیں صلے کی خواہش ہوتی ہے اور نہ تعریف کی طلب۔رباعی فرید

پربتی کی پسندیدہ صنف تھی۔ اُنھوں نے اس مشکل صنف میں بھی اپنی انفرادیت قائم کی۔ اُن کی رباعیوں میں گہرے احساسات، فکری پختگی اور تجربات کی سچائی جھلکتی ہے۔ وہ کسی بھی موضوع کو سطحی انداز میں بیان کرنے کے بجائے اس کی گہرائی میں جا کر اس کا ادراک کرتے ہیں اور پھر اسے فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

اُن کے مجموعہ رباعیات ''فرید نامہ'' اور ''خبر تحیر'' میں مختلف موضوعات پر اُن کی تحریر کردہ اہم رباعیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ''فرید نامہ'' میں شامل رباعیوں میں معاشرتی مسائل، داخلی کرب اور انسانی بے بسی کی عکاسی ملتی ہے، جب کہ ''خبر تحیر'' میں صوفیانہ فکر نمایاں ہے۔ اخلاقیات اور روحانیت کے علاوہ اُنھوں نے اپنی رباعیوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ یہ رباعیاں سادہ ہیں لیکن اِن میں گہری معنویت اور اثر آفرینی کا عنصر بدرجہ اُتم موجود ہے۔ انہوں نے رباعی کو محض روایتی موضوعات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے اخلاقی، روحانی اور فکری اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اُن کے ہاں شراب ورندی جیسے روایتی مضامین کم اور اخلاقی وروحانی موضوعات زیادہ نمایاں ہیں۔ وہ رباعیوں میں انسانی زندگی کے اہم گوشوں کو نہایت سادگی اور چابک دستی سے اس طرح فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری کے دل میں بات اُتر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے بڑے ناقدین نے بھی اُن کی رباعیوں کی تعریف کی ہے۔ نامور ناقد وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''رباعی گوئی ایک خاص فنی صلاحیت کا تقاضہ کرتی ہے۔ عروضی اور معنوی دونوں ہی سطحوں سے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ فریدؔ پربتی اِن دونوں حیثیتوں سے Genuine نظر آتے ہیں۔ رباعی ان کے مزاج سے لگاؤ کھاتی ہے اور اُن کی تخلیقی توانائی کو چست بنا کر پیش کرتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے احساسات اُن کے ذاتی احساسات ہیں۔ پھر وہ اپنے پڑھنے والوں کو ان میں شریک ہونے کی بے پایاں صلاحیت رکھتے ہیں۔ کہیں وہ فکر واحساس کے ایسے شاعر معلوم ہوتے ہیں جہاں زندگی

کے تجربے کسی کو مکمل بنا دیتے ہیں۔ ایسی تکمیل گاہے گاہے ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ چاہے صوفیت کے مسائل پیش کریں یا زمانے کے آشوب کو رباعی میں ڈھالیں وہ یکساں کامیاب نظر آتے ہیں۔'' (ہزار امکاں، کتابی دنیا، نئی دہلی، ص۔۹)

جدید اُردو شعراء میں فریدؔ پربتی جموں وکشمیر کے واحد شاعر ہیں جنھوں نے صنف رباعی میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ اِس کی سب سے بڑی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ وہ رباعی کے فن سے بخوبی واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کی رباعیاں فنی معیار پر بھی پوری اُترتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی نے اُن کے کلام میں نئے احساس اور تازہ آہنگ کی موجودگی کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''فریدؔ پربتی نے اِن دِنوں کثرت سے رباعیاں کہی ہیں۔ میرا خیال ہے وہ رباعی کے فن کی رعائتیں ملحوظ خاطر رکھنے کی صلاحتیں رکھتے ہیں جو رباعیاں میں نے دیکھیں اُن میں کہیں کہیں نئے رنگ وآہنگ اور نئے احساس کی چمک نظر آئی۔''

(فرید پربتی: شعر، شعور، شعریات۔ص، ۷۸)

فرید پربتی کی شاعری میں موضوعاتی تنوع بھی پایا جاتا ہے۔ انہوں نے عشق، تصوف، انسانی وجود، اخلاقیات اور سماجی مسائل کو اپنی رباعیوں کا حصہ بنایا۔ خاص طور پر کشمیر کی فضا، وہاں کے حالات اور انسانی المیے ان کے کلام میں نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔ اُردو کے دیگر رباعی گو شعراء کے برعکس اُن کا کلام تازہ کار لہجے اور اظہارِ ذات کے عکاسی کے لحاظ سے کافی منفرد ہے۔ اُن کی تربیت متصوفانہ ماحول میں ہوئی لیکن اُنھوں نے خود پر یا اپنی شاعری پر کبھی صوفیت کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ وہ رباعی کی زبان و عروض کے بنیادی نکات سے بخوبی واقف ہیں اور اِن نکات کو انھوں نے اپنے کلام میں بخوبی پیش کیا ہے۔ ذیل میں اُن کی دو رباعیاں ملاحظہ ہوں:

پھولوں سے چُرا کر وہ مہک بھیجتا ہے　　آکاش کی خوش رنگ دھنک بھیجتا ہے
خالی نہیں ہوسکتا ہوں وہ جانتا ہے　　زخموں کے لیے تازہ نمک بھیجتا ہے

بے کیف شب وروز کو اچھا کردے ارمان مرا اب کے یہ پورا کردے
ہیں موت کے سامان یہاں چاروں طرف اب زیست کے سامان مہیا کردے

فرید پربتی کی رباعیات کا سرچشمہ جہاں کلاسیکی شاعری کے دلکش لب و لہجے سے جڑا ہوا ہے، وہیں یہ عصر حاضر کے انسان کی پیچیدہ زندگی کی بھرپور عکاسی بھی کرتی ہیں۔اُن کی رباعیات میں ایک حساس اور باخبر فرد کے احساسات، تجربات اور داخلی کیفیات نہائت مؤثر انداز میں ظاہر ہوتے ہیں، جو قاری کو نہ صرف جمالیاتی لطف دیتے ہیں بلکہ فکری طور پر بھی بیدار کرتے ہیں۔

طوفان حوادث میں بکھرتا ہے وجود اک آگ کے دریا سے گزرتا ہے وجود
ہے غول بیاباں کا تعاقب شب وروز اس تیرہ خاک داں میں ڈرتا ہے وجود

فریدؔ پربتی رباعی جیسی مختصر صنف میں ایک تجربہ کار شاعر ہونے کی وجہ سے کم الفاظ میں گہری بات کہنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔زندگی کے پیچیدہ مسائل کو وہ بڑے فنکارانہ انداز میں روائتی حدود کو توڑ کر اِس طرح پیش کرتے ہیں کہ اُن کی رباعی میں ایک نئی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔اُن کا لہجہ ہمیشہ شعری حسن سے بھرپور رہتا ہے کیونکہ وہ محض تجربے کے لیے شاعری نہیں کرتے بلکہ بامقصد اور سنجیدہ تخلیق کے قائل ہیں۔وہ کلاسیکی غزل کی موسیقیت اور خوبصورت لفظی تراکیب سے فائدہ ضرور اٹھاتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اپنے منفرد جدید انداز اور نئے شعری پیکروں کو برت کر اِسے منفرد حیثیت بھی عطا کرتے ہیں۔

لو ڈوبا ہے مغرب میں شرارا کوئی روشن ہوا پھر چاند، نظارہ کوئی
ہر شام طلب کرتا ہے وہ مجھ سے مجھے بے نفع کہ اس میں، ہے خسارہ کوئی
ہاں جبر کے ہاتھوں کے مجبور ہوں میں پھر قہر کی ظلمت کا مقہور ہوں میں
جھٹلانے لگا وقت کا فرعون مجھے موسیٰ ہوں، تجلی ہوں میں، طور ہوں میں

عشق نہ صرف جذبات انسانی میں ایک ہم ترین مقام رکھتا ہے۔ بلکہ فارسی اور اُردو شاعری میں بھی عشق اور عشق کے لوازمات ومختلف زمانوں میں نئے نئے اسالیب اور انداز ہائے فکر سے برتا گیا ہے۔ فرید پر پتی بھی عشق کے وجود اور اُس کی لطافت احساس کے منکر نہیں ہیں۔ اُن کی رباعیوں میں عشق جیسے عظیم موضوع کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔

اخلاص کا اک مرکز ومحور ہے قریب — بے سمت وجہت رہ کا شناور ہے قریب
میں نے جو کہا عشق کا معنی کیا ہے — اُس نے یہ کہا، دیکھ سمندر ہے قریب
اکثر میں یہاں آگ کی خاطر آیا — ہاں دائرہ عقل سے باہر آیا
لوہے کے چنے چبانا ہے عشق فریدؔ — جو کر نہ سکا تھا، میں وہی کر آیا

فرید پربتی کی رباعیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُن میں جا بجا وادی کشمیر کا عکس جھلکتا ہوا نظر آتا ہے اور ساتھ ساتھ فلسفۂ حیات کی تلاش بھی اُن کے اندر موجود دکھائی دیتی ہے۔ اُن کی شاعری کے حوالے سے قاضی عبدالرحمن ہاشمی نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''فرید پربتی کی شعری جمالیات کا نکتہ، حوالہ اور محور بالعموم وادی کشمیر کی زندگی ہے۔ اس کے دری، چمن زار، سرسبز ماحول اور احساسی کیفیت کا حامل گرد وپیش کا منظر نامہ ہے جو شاعر کے وجود کے رگ وریشے میں بھی گرم خون کی مانند گردش کرتا ہے۔''

(اثبات، دیباچہ، ص۔4)

عبدالرحمن ہاشمی صاحب کے اس نکتے کی ترجمانی فرید پربتی کی اُن رباعیوں میں نظر آتی ہے جو اُنھوں نے شہر آشوب کے عنوان سے تحریر کی ہیں۔ صحن چمن کی ویرانیاں، رہزن، بنام رہبر، شیرازہ محبت کی پریشانی، انسانی وحشیانہ پن اور بے زاری موجودہ سیاسی ہلچل اور کشمیر کی تازہ صورت حال کی منظر کشی اُن کی رباعیوں میں بخوبی نظر آتی ہے۔ قاضی عبدالرحمن ہاشمی نے ایک اور جگہ فریدؔ پربتی کی شاعری سے متعلق یوں

تحریر کیا ہے:

'' فرید کو نہ صرف شعری روایات سے واقفیت ہے بلکہ اُنھوں نے کلاسیکی شاعری اور اس کی بوطیقا سے توفیق استفادہ بھی کیا ہے۔ ان کے یہاں نہ سراسر روایت پرستی ہے نہ روایت گزیدگی۔'' (اثبات، دیباچہ، ص۔4)

فرید پربتی کے کلام میں حمدیہ اور نعتیہ رباعیات بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اِس قسم کی رباعیوں میں ماضی کی روایت کی تجدید ہی نہیں بلکہ ایک نئی روش اور بڑا خوبصورت آہنگ بھی پڑھنے کو ملتا ہے۔ اِس سلسلے میں اُن کی یہ رباعی دیکھیں:

یکتا بھی یگانہ بھی مشہود و مآل یکتائی میں تحلیل ہوا عزّ و جلال
حیران تفکر ہے تحمل نگراں دریا میں ہوا غرق مرا جام سفال

حمد و نعت کے علاوہ دعا، شہر آشوب، سرمد کے مزار پر جیسے موضوعات پر بھی اُن کے یہاں خوبصورت رباعیاں ملتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ تغیرات زمانہ، عصری مسائل اور دیگر موضوعات بھی اُن کی رباعیوں میں نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں فریدؔ پربتی کی یہ دو رباعیاں ملاحظہ ہوں:

ہر لحظہ نئے سانچے میں ڈھلتی ہے یاد ناگن کی طرح دودھ میں پلتی ہے یاد
خوشبو کی طرح پھیلتی ہے نس نس میں صندل کے تلے پھولتی پھلتی ہے یاد

پھر پیرہن جاں کی مہک آنے لگی کافر ہوں ایماں کی مہک آنے لگی
ہیں روح فزا بادِ صبا کے جھونکے کس سمت سے انساں کی لہک آنے لگی

شاعر سماج اور معاشرے کا عکاس اور ترجمان ہوتا ہے، اس لیے اُس کے اردگرد کا ماحول اُس کی شاعری پر گہری چھاپ چھوڑتا ہے۔ خوشی اور غم کے مختلف واقعات اور حادثات ایک سچے فنکار کے ہاں نہایت دلنشین اور فنی انداز میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وادیٔ کشمیر کے نامساعد حالات کو فریدؔ پربتی نے اپنی رباعیوں میں بڑی فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ اُن کے مجموعہ ''اثبات'' سے چند رباعیات ملاحظہ ہوں جن

میں کشمیر کے عصری حالات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے:

برباد ہوا صحن چمن، رقص میں ہوں ویرانہ بنا اپنا وطن، رقص میں ہوں
اب کے نہیں ارتباط روح وتن باقی رہ برہے، بشکل راہ زن، رقص میں ہوں
شیرازہ محبت کا پریشان ہوا غارت عیش وسکون کا سامان ہوا
اُس دور میں جیتا ہوں کہ جس میں انساں وحشی درندہ اور حیوان ہوا
ہاتھوں میں نہ ہے کس، نہ بازو میں زور جینے کا سلیقہ ہے، نہ مرنے کا طور
ہر شخص ہے بیزار یہاں آپ اپنے سے کیا یہ زمانہ ہے، یہ ہے کونسا دور

اِن رباعیوں میں فریدؔ نے کشمیر کی تباہی و بربای کے دلدوز حالات کی تصویر بڑی فنکاری سے کھینچی ہے۔فرید نے خوبصورت الفاظ کو خوبصورت انداز میں پیش کر کے اپنی فنی بالیدگی کا ثبوت دیا ہے۔ فارسی الفاظ ہونے کے باوجود اُن کی رباعیوں میں استعمال شدہ الفاظ اُردو کے اپنے لفظ معلوم ہوتے ہیں اور یہ مناسب تراکیب فریدؔ پربتی کی شاعری کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہیں۔فرید پربتی نے اپنے کلام کے ہر مجموعہ میں کشمیر کے حالات کی عکاسی کی ہے''اثبات'' کے بعد اُن کی رباعیوں کے مشہور ومعروف مجموعے''فریدنامہ'' کا آغاز بھی کشمیر کے حسن کی تعریف سے ہوتا ہے:

واقف میں ہر اک خواب کی تعبیر سے ہوں میں حسن ہوں اور حسن کی جاگیر سے ہوں
کہتے ہیں مجھے یوسف ثانی اے دوست کنعاں سے نہیں، وادی کشمیر سے ہوں

یہ رباعی خوداعتمادی اور حسنِ بیان کی مثال ہے۔شاعر کہتا ہے کہ وہ ہر خواب کی تعبیر سے واقف ہے، یعنی اُسے زندگی کی حقیقتوں اور خواہشات کے انجام کا ادراک ہے۔پھر وہ اپنی ذات کو حسن سے تشبیہ دیتا ہے، جیسے وہ خود خوبصورتی کی علامت اور اس کی میراث ہو۔''یوسفِ ثانی'' کہنا حضرت یوسف کی طرف اشارہ ہے، جو اپنی بے مثال خوبصورتی کے لیے مشہور ہیں۔آخر میں شاعر فخر سے کہتا ہے کہ وہ کنعان (حضرت یوسفؑ کا علاقہ) سے نہیں بلکہ وادیٔ کشمیر سے ہے۔یعنی اپنی سرزمین کی خوبصورتی کو بھی

نمایاں کرتا ہے۔ مجموعی طور پر، یہ رباعی حسن، خودشناسی اور اپنی شناخت پر فخر کو بڑی دلکش انداز میں بیان کرتی ہے۔

فرید پربتی اگرچہ صوفیانہ اور قلندرانہ مزاج رکھتے تھے، تاہم اُنھوں نے روایت کے مطابق خمریاتی رباعیاں بھی کہیں ہیں۔ اُنھوں نے رندی اور حسن پرستی کے مضامین کو غالباً اس لیے اختیار کیا کہ کلام میں تنوع اور نیا ذائقہ پیدا ہو سکے۔ اس کے نتیجے میں اُن کی رباعیوں میں شباب اور حسن کی دلکشی نمایاں طور پر اُبھر کر سامنے آتی ہیں۔ اُن کی خمریاتی رباعیات میں سرور، کیف اور سرشاری کی کیفیت محسوس کی جا سکتی ہے۔ ذیل میں اُن کی رباعیات ملاحظہ ہوں:

ساغر ہے، قرابا ہے مغاں گردش میں — گردش میں زمیں ہے، آسماں گردش میں
تقدیر بدل، رندوں کی صحبت میں آ — میخانے میں، ہر ایں وآں گردش میں

ہر وقت صراحی یہ بھری رہتی ہے — شبنم سے ہر اک شاخ ہری رہتی ہے
کرلوں میں ستاروں کی تمنا کیونکر — سورج پہ نظر، میری دھری رہتی ہے

ساقی نے کہا ہر ایک سبو تیرا ہے — ابر، ہوا، روئے نکو، تیرا ہے
پہلے ہے یہی شرط کہ اپنا ہو جا — پھر اس کے بعد، چار سو تیرا ہے

فرید پربتی کی رباعیاں کلاسیکل اور جدید عناصر کا ایک خوبصورت امتزاج ہیں۔ وہ ماضی کی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے حال کے تقاضوں کے مطابق شاعری کرتے ہیں۔ اُن کو زبان پر مکمل دسترس ہے جس کی بدولت وہ الفاظ کو نہایت مہارت اور آسانی سے استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے خیالات بلند، منفرد اور کسی حد تک نرالے ہیں۔ اس کی مثال کے طور پر درج ذیل دو رباعیاں پیش کی جا سکتی ہیں، جن میں شاعر نے نئے موضوعات کو بڑی فنکارانہ خوبی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ پہلی رباعی میں شاعر امید اور روحانیت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ اس کی نعت اور مناجات ایک دن اس کے لیے کامیابی اور بہتری کا سبب بنیں گی۔ وہ خدا کے کرم پر مکمل بھروسا ظاہر کرتا ہے اور

اس بات پر بھی یقین رکھتا ہے کہ خدا اس کے حالات سے بخوبی واقف ہے۔جبکہ دوسری رباعی میں شاعر کا انداز تنقیدی ہوجاتا ہے۔ یہاں وہ معاشرے کے بگڑتے ہوئے معیار اور لوگوں کی خاموشی پر سوال اٹھاتا ہے۔ وہ سوچنے اور بولنے کی ترغیب دیتا ہے اور اہلِ فکر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو آزاد کریں اور نئے خیالات کو اپنائیں۔اس طرح اُن رباعیوں میں سادہ اور بلیغ زبان، منفرد خیالات، اور روایت و جدت کا حسین امتزاج نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

روشن کبھی ہوجائیں گے دن رات مرے　　لائیں گے ثمر نعت و مناجات مرے
مجھ کو فقط اس کے کرم پر ہے نظر　　ہیں مدنظر اس کو بھی حالات مرے

بازار کے معیار کو اب تول ذرا　　خاموش ہے کیوں بول ذرا
تازہ ہیں مضامین نئی طرز ادا　　اے فکر رسا بند قبا کھول ذرا

فرید پربتی کی شاعری میں معنوی گہرائی کے ساتھ ساتھ معنوی وسعت بھی بدرجہ اُتم موجود ہے، اور یہی وصف اُن کے کلام کو امتیازی حیثیت عطا کرتا ہے۔اُن کا ہر شعر اپنے اندر ایک نئی دنیا سمیٹے ہوئے محسوس ہوتا ہے۔ان کے ہاں نہ موضوعات کی تنگی کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی لفظیات کی کمی کا۔خواب، تعاقبِ لمحات، گریزاں، عصرِ رواں، شفق، جگنو، آئینہ، ریت اور شمع جیسے الفاظ بار بار اس انداز سے سامنے آتے ہیں کہ قاری کے باطن میں ایک ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔اُن کی شاعری، خصوصاً رباعیوں میں، بصری استعاروں کا نمایاں غلبہ ہے۔ سرو اور چنار، دشت اور سراب، آئینہ، سمندر، ستارے، دیوار، بگولہ، غبار، سائے، بادباں، اوس، آندھی، درخت، پھوار، خار و خس، کشتی، کھیتی، مکان، پرندے، شاخ، برگ و شجر، ثمر، شمع، چراغ، کشکول، گھر، چولہا، سحاب، بھنور، تیشہ و تبر، تیر و سناں اور تیلیاں جیسے استعارے اُن کے ہاں کثرت سے ملتے ہیں۔اگرچہ بعض اوقات ان استعاروں کی زیادتی رباعیوں کو قدرے ثقیل بنا دیتی ہے، تاہم فریدؔ پربتی نے نہایت جامع اور مربوط اسلوب میں اپنے مشاہداتی تجربات کو بھرپور

انداز میں پیش کیا ہے۔فرید پربتی کی رباعی نگاری کے حوالے سے متعدد ناقدین نے اظہارِخیال کیا ہے،جن میں سلیم سالک بھی شامل ہیں۔وہ اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

''فرید پربتی نے روایتی اسلوب کوایک نیا آہنگ وپیراہن بخش کرایک نئ ڈگر قائم کرنے کی کوشش ہے۔جو قابل تعریف ہی نہیں بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔انہوں نے ذہنی اختراع اورتخلیقی صلاحیت کو بروائے کارلاکر رباعی جیسی مشکل صنف سخن کومنہ ہی نہیں لگایا بلکہ اس میں باقاعدہ مردمیدان کی اختیار کرکے رباعی کے نقاد کےطور پر بھی حیثیت ایک شناخت بنالی ہے۔'' (فرید پربتی شعر،شعور،شعریات،ص۔34)

مجموعی طور پر دیکھا جائے توفریدؔ پربتی کےشعری سفر کی اصل محرک اُن کا منفرد اسلوب اورداخلی آواز ہے۔اُنھوں نے شاعری کا آغاز اس احساس کےتحت کیا کہ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے۔انھوں نے اپنے خیالات،مشاہدات اور جذبات کو نہایت سادہ اور براہِ راست الفاظ میں بیان کیا،اور اس عمل میں نہ انہیں کسی صلے کی خواہش رہی اور نہ ہی ستائش کی طلب۔یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں فطری سادگی، والہانہ پن،احساس کی شدت اور جذبوں کی خلوص آمیز جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔وہ اپنی باطنی آواز کوفنی مہارت کےساتھ ظاہر کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں اوراپنے کلام میں روح پھونک دیتے ہیں۔اُن کا یہی فکری اسلوب محبت کوتصوف کے راستوں سے ہمکنار کرتا ہے۔اُن کے ہاں زبان و بیان کی شگفتگی کے ساتھ ساتھ فکری تازگی اور جدت بھی موجود ہے،جس کے باعث اُن کی رباعیوں کوایک منفرد رنگ اور شناخت حاصل ہوئی ہے۔

فرید پربتی ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت تھے جنہوں نے شاعری،تحقیق اورتنقید کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں۔خصوصاً رباعی گوئی میں اُن کی مہارت اور تخلیقی انفرادیت نے انہیں اُردو ادب میں ممتاز مقام عطا کیا۔ان کی شاعری سادگی،

خلوص، فکری گہرائی اور روحانیت کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ انہوں نے رباعی کو محض ایک فنی صنف کے طور پر نہیں بلکہ ایک فکری اور اخلاقی اظہار کے مؤثر وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ وہ اُردو ادب کے اُن اہم شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ اُن کی رباعیاں فنی استحکام کے ساتھ ساتھ فکری اور اخلاقی اعتبار سے بھی نہایت بامعنی ہیں۔ اُنہوں نے رباعی کو نئی جہت عطا کرتے ہوئے اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ اُن کی شاعری آج بھی قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتی ہے اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

اکتساب فیض:

1۔ خبر تحیر۔ فرید پربتی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2007

2۔ فرید پربتی شعر، شعور، شعریات۔ سلیم سالک

3۔ اثبات۔ فرید پربتی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

4۔ فریدنامہ۔ فرید پربتی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

5۔ ہزار امکان۔ فرید پربتی، کتابی دُنیا دہلی

6۔ فرید پربتی: فن اور شخصیت۔ ڈاکٹر محمد اشرف، شعبہ اُردو جموں یونی ورسٹی 2015

☆☆☆

Urdu Tadrees, Technology aur Qaumi Talimi Policy 2020 ke tanazur mein Urdu Zaban ki Tadrees ki Ahmiyat aur Zaroorat by Dr. Taiyaba Nazli (Asso.Prof.dept. of Education & Training, MANUU, Hyderabad

ڈاکٹر طیبہ نازلی (ایسوسیئٹ پروفیسر، شعبۂ تعلیم و تربیت، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)

cell-6276877298

اردو تدریس، ٹیکنالوجی اور قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں

(اردو زبان کی تدریس کی اہمیت اور ضرورت)

ABSTRACT: قومی تعلیمی پالیسی 2020 (NEP 2020) ہندوستانی تعلیم م ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے، جس نے مادری زبانوں اور علاقائی زبانوں کو تدریس کا بنیادی ذریعہ قرار دیا ہے۔ اس پالیسی کے مطابق ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دی جانی چاہیے تاکہ طلبہ اپنی شناخت، ثقافت اور فکری صلاحیتوں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ اردو، جو برصغیر کی ایک بڑی زبان ہے، اس پالیسی کے تناظر میں نہ صرف تعلیمی بلکہ سماجی و ثقافتی سطح پر بھی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ مقالہ اردو تدریس کی ضرورت، اس کے فوائد، مسائل، عالمی تناظر اور مستقبل کے امکانات کا جامع تجزیہ پیش کرتا ہے اور Case Studies کے ذریعے اس کی افادیت کو واضح کرتا ہے۔

(Keywords) کلیدی الفاظ : اردو تدریس، قومی تعلیمی پالیسی 2020، مادری زبان، ثقافتی ورثہ، عالمی تناظر، تعلیم میں شمولیت، کیس اسٹڈیز۔

***INTRODUCTION*:-** اردو زبان برصغیر کی ایک اہم علمی و ادبی زبان ہے

جس کی تدریس روایتی طور پر کتابوں اور تختہ ؟ سیاہ پر مبنی رہی ہے۔ تاہم موجودہ دور میں ٹیکنالوجی نے تعلیم کے میدان میں انقلاب برپا کیا ہے اور اردو کی تدریس بھی اس سے مستفید ہو رہی ہے۔ اس مطالعے میں اردو تدریس میں ٹیکنالوجی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے، جن میں اسمارٹ کلاس رومز، آن لائن لرننگ پلیٹ فارمز، ملٹی میڈیا وسائل، ڈیجیٹل لائبریریاں، موبائل ایپلیکیشنز، سوشل میڈیا اور مصنوعی ذہانت شامل ہیں۔ ٹیکنالوجی اردو زبان کی تدریس کو نہ صرف جدید تقاضوں کے مطابق ڈھال رہی ہے بلکہ اسے نئی نسل کے لیے زیادہ پرکشش اور قابلِ رسائی بھی بنا رہی ہے۔ اردو تدریس، ٹیکنالوجی، اسمارٹ کلاس روم، آن لائن لرننگ ڈیجیٹل لائبریری، موبائل ایپلیکیشنز، مصنوعی ذہانت اردو زبان برصغیر کی تہذیب اور ثقافت کی آئینہ دار ہے، روایتی تدریس میں استاد اور کتاب مرکزی حیثیت رکھتے تھے لیکن آج کے دور میں طلبہ ڈیجیٹل دنیا کے تقاضوں کے مطابق تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جاننا یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کس طرح اردو تدریس کو جدید، مؤثر اور عالمی سطح پر قابلِ رسائی بنا رہی ہے۔

ادبی و تحقیقی پس منظر Literature Review

۔ Charyulu & Basha 2024)) نے اردو میڈیم اسکولوں میں ICT کے استعمال کو مؤثر قرار دیا۔

۔ Imam Gunasekaran and2025)) نے قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں اردو اداروں میں ٹیکنالوجی کے انضمام پر روشنی ڈالی۔

۔ Abdurakhmonova et al. (2025) نے جدید تعلیمی ٹیکنالوجیز کے استعمال کو اردو تدریس کے لیے مفید قرار دیا۔

۔ Yezdani2025)) نے اردو تدریس میں ٹیکنالوجی کے مواقع اور مسائل پر بحث کی۔

اسمارٹ کلاس رومز: ۔ ڈیجیٹل بورڈز اور پروجیکٹرز نے اردو قواعد اور ادب کو بصری انداز

میں پیش کرنا آسان بنا دیا ہے۔

آن لائن لرننگ پلیٹ فارمز:۔زوم، گوگل کلاس روم اور مائیکروسافٹ ٹیمز نے اردو تدریس کو عالمی سطح پر قابلِ رسائی بنایا۔

ملٹی میڈیا وسائل 2 آڈیو اور ویڈیو لیکچرز نے اردو تلفظ اور ادبی ذوق کو بہتر بنایا۔

ڈیجیٹل لائبریریاں: 1 اردو ادب کے نایاب مخطوطات اور لغات کو محفوظ کر کے تحقیق کو آسان بنایا گیا۔

موبائل ایپلیکیشنز 3 اردو ذخیرہء الفاظ اور خوشخطی کی مشق کے لیے ایپس نے طلبہ کو سہولت فراہم کی۔ مصنوعی ذہانت 4 AI(AI) پر مبنی ایپس طلبہ کی کارکردگی کا تجزیہ کرتی ہیں اور شخصی مشقیں فراہم کرتی ہیں۔

عالمی تناظر 5 ریختہ اور اردو پوائنٹ جیسے پلیٹ فارمز نے اردو ادب کو عالمی سطح پر متعارف کرایا چنانچہ ٹیکنالوجی نے اردو تدریس کو زیادہ دلچسپ اور قابلِ رسائی بنایا۔

۔طلبہ کی شخصی تعلیم اور ڈیجیٹل مہارتوں میں اضافہ ہوا۔

۔اردو ادب کو محفوظ کرنے کے نئے ذرائع سامنے آئے۔

۔عالمی سطح پر اردو کو فروغ دینے کے مواقع بڑھے۔

اردو زبان کی تدریس میں ٹیکنالوجی کا استعمال نہ صرف تعلیمی معیار کو بلند کر رہا ہے بلکہ زبان کو نئی نسل کے لیے زیادہ پرکشش اور قابلِ رسائی بنا رہا ہے۔ مستقبل میں اگر اردو تدریس کو مصنوعی ذہانت، مشینی ترجمہ اور عالمی ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے ساتھ جوڑا جائے تو یہ زبان نہ صرف محفوظ رہے گی بلکہ عالمی سطح پر مزید فروغ پائے گی۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور تدریس اردو:۔ مادری زبان کسی بھی قوم کی تہذیب اور ثقافت کی بنیاد ہوتی ہے۔اردو زبان برصغیر کی ایک عظیم زبان ہے جس نے صدیوں تک علمی، ادبی اور تہذیبی روایات کو آگے بڑھایا۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے مادری زبانوں کو تعلیم کا بنیادی ذریعہ قرار دیا ہے۔اس تناظر میں اردو کی تدریس نہ صرف تعلیمی

معیار کو بلند کرتی ہے بلکہ قومی یکجہتی اور ثقافت ہم آہنگی کو بھی فروغ دیتی ہے۔
اس قومی تعلیمی پالیسی کو اردو کی تدریس کے تناظر میں دیکھنا اس لیے ضروری ہے یہ زبان نہ صرف ہندوستانی معاشرت کا حصہ ہے بلکہ عالمی سطح پر بھی لاکھوں افراد کی زبان ہے۔
ادبی و تحقیقی پس منظر: NEP 2020 نے مادری زبانوں کو ابتدائی تعلیم کا ذریعہ بنانے پر زور دیا۔ محققین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مادری زبان میں تعلیم طلبہ کی تخلیقی صلاحیت اور فہم کو بڑھاتی ہے۔ عالمی سطح پر مادری زبانوں کی تدریس کو تعلیمی کامیابی کی بنیاد سمجھا جاتا ہے اور اردو زبان کو ہندوستانی لسانی تنوع کا اہم حصہ قرار دیا گیا ہے۔

اردو میں تدریس کی اہمیت:۔

.1 ثقافتی ورثے کا تحفظ: اردو زبان صدیوں پر محیط ادبی ورثے کی حامل ہے۔ اس کی تدریس نئی نسل کو اپنی تہذیب اور تاریخ سے جوڑتی ہے۔ جیسا کہ فیض احمد فیض نے کہا تھا: "زبان صرف اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ تہذیب کا آئینہ ہے"۔

.2 تعلیمی کارکردگی میں بہتری: NEP 2020 کے مطابق مادری زبان میں تعلیم طلبہ کی فہم اور کارکردگی کو بہتر بناتی ہے۔ اردو تدریس اس اصول کو عملی جامہ پہناتی ہے۔

.3 قومی یکجہتی: اردو ایک رابطے کی زبان ہے جو مختلف لسانی گروہوں کے درمیان پل کا کام کرتی ہے۔

.4 عالمی تناظر: اردو دنیا بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کی تدریس بین الاقوامی سطح پر ہندوستانی ثقافت کو فروغ دیتی ہے۔

کیس اسٹڈیز Case Studies

.1 کا نفاذ:۔ حیدرآباد کے اردو میڈیم اسکولز میں NEP 2020

NEP 2020 کے بعد حیدرآباد کے کئی اردو میڈیم اسکولز نے ابتدائی جماعتوں میں مادری زبان کو تدریس کا ذریعہ بنایا۔ اساتذہ نے بتایا کہ طلبہ کی فہم اور دلچسپی میں 40٪ کا اضافہ ہوا۔ اردو میں بنیادی مضامین پڑھانے سے طلبہ نے نہ صرف زبان پر عبور حاصل

کیا بلکہ ریاضی اور سائنس جیسے مضامین کو بھی بہتر طور پر سمجھا۔

.2 ریختہ ڈیجیٹل پلیٹ فارم کا کردار: ریختہ فاؤنڈیشن نے اردو ادب کو ڈیجیٹل شکل میں لاکھوں قارئین تک پہنچایا۔ NEP 2020 کے بعد اس پلیٹ فارم کو اسکولوں اور کالجوں میں بطور ڈیجیٹل لائبریری استعمال کیا جانے لگا۔ طلبہ کو کلاسیکی ادب، شاعری اور نثر تک آسان رسائی ملی، جس سے اردو تدریس کو عالمی سطح پر تقویت ملی۔

.3 دہلی یونیورسٹی میں اردو اور ٹیکنالوجی کا امتزاج: دہلی یونیورسٹی نے NEP 2020 کے بعد اردو شعبے میں آن لائن کورسز شروع کیے۔ Zoom اور Google Classroom کے ذریعے اردو ادب اور لسانیات کے لیکچرز دنیا بھر کے طلبہ تک پہنچنے لگے۔ اس اقدام نے اردو کو ایک عالمی زبانِ تعلیم کے طور پر متعارف کرایا۔

.4 برطانیہ میں اردو بطور مادری زبان: برطانیہ میں پاکستانی و ہندوستانی کمیونٹی کے اسکولوں نے NEP 2020 کے اصولوں کو اپناتے ہوئے اردو کو ابتدائی تعلیم کا حصہ بنایا۔ ایک تحقیق کے مطابق اردو پڑھنے والے طلبہ نے انگریزی اور دیگر مضامین میں بھی بہتر کارکردگی دکھائی کیونکہ مادری زبان میں تعلیم نے ان کی فکری بنیاد مضبوط کی۔

.5 آن لائن ایپلیکیشنز اور اردو سیکھنے والے طلبہ:

"Urdu Learning App" اور "Learn Urdu Quickly" جیسی ایپس نے NEP 2020 کے بعد طلبہ کو اردو سیکھنے میں مدد دی۔ یہ ایپس خاص طور پر دیہی علاقوں کے طلبہ کے لیے مفید ثابت ہوئیں جہاں اسکولوں میں اردو اساتذہ کی کمی تھی۔

اعداد و شمار اور تجزیہ: -2023 میں ہندوستان کے 12 ریاستوں میں اردو کو ابتدائی سطح پر تدریس کے لیے شامل کیا گیا۔ -ایک سروے کے مطابق، اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد تقریباً 1.5 کروڑ ہے۔

-برطانیہ اور امریکہ میں اردو سیکھنے والے طلبہ کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔

مسائل و چیلنجز: -اردو اسکولوں میں انفراسٹرکچر کی کمی۔

-اساتذہ کی تربیت کی ضرورت۔ -مادری زبان کی تدریس کے لیے پالیسی پر عمل درآمد میں مشکلات۔
-ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر اردو مواد کی کمی۔
-عالمی سطح پر اردو کو فروغ دینے کے لیے حکومتی تعاون کی کمی۔
عملی تجاویز: -اردو اساتذہ کے لیے تربیتی پروگرامز۔
-اردو نصاب کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنا۔
-ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر اردو مواد کی فراہمی۔
-بین الاقوامی سطح پر اردو جرنلز اور تحقیقی اداروں کے ساتھ تعاون۔
-اردو ادب کو آرٹیفیشل انٹیلیجنس کے ذریعے محفوظ اور تجزیہ کرنا۔

اردو تدریس کے فوائد کے ساتھ ساتھ اس کے مسائل بھی ہیں لہٰذا انفراسٹرکچر کی کمی اور اساتذہ کی تربیت کی ضرورت سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ تاہم اگر حکومت اور تعلیمی ادارے مل کر کام کریں تو یہ مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

مستقبل کے امکانات Future Prospects:- NEP 2020 کے تحت اردو تدریس آنے والے برسوں میں عالمی سطح پر اثر ڈال سکتی ہے۔
-اردو کو ڈیجیٹل پلیٹ فارمز اور ای-لرننگ کے ذریعے مزید فروغ دیا جا سکتا ہے۔
-اردو ادب کو عالمی سطح پر متعارف کرانے کے لیے بین الاقوامی کانفرنسز اور سیمینارز منعقد کیے جا سکتے ہیں۔

CONCLUSION:- اس مطالعے میں اردو تدریس میں ٹیکنالوجی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے، جن میں اسمارٹ کلاس رومز، آن لائن لرننگ پلیٹ فارمز، ملٹی میڈیا وسائل، ڈیجیٹل لائبریریاں، موبائل ایپلیکیشنز، سوشل میڈیا اور مصنوعی ذہانت شامل ہیں۔ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ٹیکنالوجی اردو زبان کی تدریس کو نہ صرف جدید تقاضوں کے مطابق ڈھال رہی ہے بلکہ اسے نئی نسل کے لیے زیادہ پرکشش اور قابلِ

رسائی بھی بنا رہی ہے۔
مستقبل میں اگر اردو تدریس کو مصنوعی ذہانت، مشینی ترجمہ اور عالمی ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے ساتھ جوڑا جائے تو یہ زبان نہ صرف محفوظ رہے گی بلکہ عالمی سطح پر مزید فروغ پائے گی۔NEP 2020 کے تناظر میں اردو زبان کی تدریس نہ صرف تعلیمی ضرورت ہے بلکہ ثقافتی اور عالمی سطح پر بھی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ زبان ہندوستانی شناخت کا حصہ ہے اور اس کی تدریس نئی نسل کو اپنی جڑوں سے جوڑنے کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر ہندوستانی ورثے کو اجاگر کرتی ہے۔

REFERENCES:

Effective .(2024)Charyulu, G. M.&Basha, S. R.,1. language teaching in Urdu medium schools with the integration of ICT tools. Educational ,(4) Theory and Practice, 30:Administration 7265–7269.

Integration of.(2025)Imam, Z.&Gunasekaran, V.,2. technology in Urdu medium institutions through the 2020.((NEPoutlook of National Education Policy 200–212.,(2)Tareekh-e-Adab-e-Urdu Journal, 7

Sharakhmetova, M., Abdurakhmonova, M., 3. .(2025)Mirzayeva, M.&Zakirova, U.,Yusupova, M., The effectiveness of using modern educational technologies in teaching Urdu. Tashkent State University of Oriental Studies.

Technological resources and .(2025) Yezdani, T.4.
Opportunities and :Urdu language teaching
Publication.&challenges. World Urdu Research
Digital transformation in Urdu .(2023) Khan, A.5.
A case study of South Asian institutions.:pedagogy
Journal of Language and Education Technology,
145–160.,(3)12
6.Ministry of Education, Government of India.
*National Education.(2020)

☆☆☆

Kutub Khana-o- Idara-e-Tahqeeq-e-Makhtutaat-e-Mashriqi Hyderabad : Ek Qadeem-o-Nayab Ilmi Khazana by AlmasFatima and Dr. MD. Rizwan (dept. of Persian & Central Studies, MANUU, Hyderabad)cell-9844963518

الماس فاطمہ اور ڈاکٹر محمد رضوان (شعبۂ فارسی و مطالعات وسط ایشیاء، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)

کتب خانہ و ادارۂ تحقیقِ مخطوطات مشرقی، حیدرآباد
(ایک قدیم و نایاب علمی خزانہ)

تلخیص:

مخطوطات کسی بھی تہذیب اور قوم کے علمی، فکری، مذہبی اور ادبی وراثت کا قیمتی سرمایہ ہے۔ ہندوستان کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جن کے پاس نایاب متون اور علمی ثقافت ہے اور اس علمی وراثت و ثقافت کے محافظ یہاں کے کتب خانے ہیں ان کتب خانوں میں کچھ جدید اور کچھ قدیم ہیں، جو ہندوستان کے قریہ قریہ اور شہروں میں قائم ہیں۔ جیسے کہ ہندوستان کی مشہور لائبریریز میں نیشنل لائبریری (کلکتہ)، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ)، انجمن ایشائی (ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)، رام پور رضا لائبریری (یوپی)، عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان (ٹونک) اور سالار جنگ لائبریری (حیدرآباد) وغیرہ جن میں کروڑوں کی تعداد میں مشرقی علوم کے حوالے سے مخطوطات و کتابیں دستیاب ہیں اور اسی طرح کتب خانہ و ادارۂ تحقیق مخطوطات مشرقی حیدرآباد، کو بھی ہندوستان کے اہم علمی اور ادبی مراکز میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ادارے نہ صرف نادر و نایاب مخطوطات کے محافظ ہیں بلکہ محققین کے لیے ایک اہم مرکز بھی ہے۔ اور اسی طرح برٹش کونسل لائبریری، عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری (بھارت رتن ڈاکٹر. بی.

آر. آمبیڈکر لائبریری)، اسٹیٹ سینٹرل لائبریری (آصفیہ لائبریری)، ادارۂ ادبیات اردو لائبریری، کتب خانہ جامعہ نظامیہ، تلنگانہ اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ، سالار جنگ لائبریری، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، کتب خانہ سعیدیہ اور سیٹی سنٹرل لائبریری وغیرہ حیدرآباد کے مشہور و معروف کتب خانہ ہیں۔

کلیدی الفاظ: کتب خانہ و ادارۂ تحقیقِ مخطوطات مشرقی، آصفیہ لائبریری، تلنگانہ اسٹیٹ آرکائیوز، قدیم علمی خزانہ، نسخہ جات و مخطوطات، ذخیرہ اندوزی، محلِ وقوع، تحقیقی اہمیت۔

حیدرآباد ہندوستان کے اہم اور مشرقی تہذیب و تمدن کی دلدادہ ریاستوں میں ایک رہی ہے۔ حیدرآباد کی ثقافت مشرقی تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ یہاں کی، ملبوسات روایتی تہوار، گیت، قوالی، کلاسیکی موسیقی اور فن معماری (چارمینار، مکہ مسجد، فلک نما، چاؤمحلہ پیلس، سات گنبد، قلعہ گولکنڈہ وغیرہ) سب تہذیبی قدروں کے عکاس ہیں۔ یہاں کی زبان ایک خاص "دکنی شائستگی" کے ساتھ جانی جاتی ہے جس میں تہذیب، ادب اور احترام جھلکتا ہے۔ حیدرآباد صرف ایک جغرافیائی علاقہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی علامت ہے۔ یہ شہر ان چند ریاستوں میں سے ایک ہے جہاں مشرقی تمدن کو صرف محفوظ ہی نہیں رکھا گیا بلکہ اسے نئی نسل تک بھی منتقل کیا گیا۔ آج بھی جب ہم حیدرآباد کی گلیوں، اداروں، اور مجالس میں جھانکتے ہیں تو ماضی کی علمی روشنی، ادبی لطافت اور تہذیبی نرمی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ بلاشبہ حیدرآباد ہندوستان کا وہ چراغ ہے جس کی لو مشرقی تہذیب کو روشن رکھے ہوئے ہے۔ نظام دکن کی طویل حکمرانی نے اس شہر کو علمی، ادبی، فکری اور ثقافتی بلندیوں تک پہنچایا۔

حیدرآباد کا تاریخی پس منظر: حیدرآباد کی بنیاد 1591ء میں محمد قلی قطب شاہ نے رکھی، جو خود ایک شاعر، تہذیب یافتہ اور روشن خیال حکمران تھے۔ بعد ازآں آصف جاہی سلسلے کے نظاموں نے اس خطے کو ایک تہذیبی مرکز کی حیثیت سے مستحکم کیا۔ ان کے دور میں فارسی اور اردو زبان کو سرکاری اور ادبی زبان کی حیثیت حاصل ہوئی۔ مدارس، کتب

خانے، دارالترجمہ، اور علمی ادارے قائم کیے گئے جنہوں نے علم وفن کو خوب پروان چڑھایا۔ حیدرآباد میں علوم وفنون سے دلچسپی کا واضح ثبوت اس شہر کی چار صدیوں پر محیط علمی وادبی تاریخ سے ملتا ہے۔ یہاں تعلیمی وتدریسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف، کتابوں کی طباعت واشاعت اور کتب کے ذخیرے کو محفوظ رکھنے کا شوق نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اسی مضبوط علمی پس منظر کے باعث حیدرآباد کو بجا طور پر کتب خانوں کا شہر کہا جاسکتا ہے۔ ۲؎

حیدرآباد کے علمی وفکری ادارے:

نظام دکن کی سرپرستی میں حیدرآباد میں کئی علمی ادارے قائم کیے گئے، مثلاً:

- جامعہ نظامیہ (1876ء): دینی تعلیم وتدریس کا اہم مرکز۔
- عثمانیہ یونیورسٹی (1918ء): پہلی جامعہ جس میں اردو ذریعہ تعلیم رہا۔
- ادارہ ادبیات اردو۔ 1931ء ۳؎
- انجمن ترقی اردو۔
- مدرسہ عالیہ 1872ء۔
- ریاستی کتب خانے (اسٹیٹ سنٹرل لائبریری) 1891ء۔

ان اداروں نے نہ صرف تعلیم بلکہ تحقیق، تصنیف وتالیف اور ادبی ترقی کو بھی فروغ دیا۔ ان میں اور ایک قابل ذکر ادارہ " کتب خانہ وادارۂ تحقیق مخطوطات مشرقی" ہے۔

ادارہ کا قیام اور ابتدائی مرحلہ (1967-1969) ءکتب خانہ وادارۂ تحقیق مخطوطات مشرقی کا قیام 1967 عیسوی میں تلنگانہ اسٹیٹ آرکائیور ڈپارٹمنٹ میں ہوا۔ اس کا مقصد ریاستوں کے مختلف حصوں میں موجود قیمتی اور نایاب مخطوطات کو جمع کر کے محفوظ کرنا اور انہیں محققین کے لیے دستیاب کرانا تھا۔ ابتداء میں کتب خانہ و ادارۂ تحقیق مخطوطات مشرقی آرکائیوز ڈپارٹمنٹ میں اپنا کام انجام دے رہی تھی بعد ازآں اسے اسٹیٹ سینٹرل لائبریری بلڈنگ میں منتقل کر دیا گیا جو کہ پہلے کتب خانے آصفیہ کے نام

سے مشہور تھی۔ اور 25 جولائی 1969ء کو تلنگانہ کے اس وقت کے معزز و محترم وزیر برائے تعلیم سری پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ نے مشرقی مطالعہ کے لیے تلنگانہ اسٹیٹ آرکائیوز ڈپارٹمنٹ کی ایک علیحدہ شاخ کے طور پر کھولنے کا اعلان کیا۔ ۴؎

ادارہ کی مکمل آزادی اور علیحدہ ڈائریکٹوریٹ (1971-1975)ء

1941 عیسوی میں حکومت نے کتب خانہ و ادارہ تحقیق مخطوطات مشرقی حیدرآباد کو خود مختار ڈائریکٹوریٹ بنانے کا فیصلہ لیا۔ اس نقطہ نظر سے کہ تحقیق کے لیے بہتر سہولیات فراہم کی جائے اور کتب خانۂ مخطوطات کو ریسرچ انسٹیٹیوٹ یعنی تحقیقی ادارے کے طور پر ترقی دی جائے۔ ۵؎

1971 عیسوی میں پانچویں پنج سالہ منصوبہ کے دوران اس کتب خانہ کو تحقیقی ادارے کا درجہ دیا گیا اور کتب خانۂ مخطوطات مشرقی کے وِنگ کے لیے حکومت کی طرف سے اس کام کے لیے جوائنٹ ڈائریکٹر کے عہدے کی منظوری دی گئی اور اس کا اختیار تلنگانہ اسٹیٹ کے آرکائیوز ڈپارٹمنٹ کو دیا۔ یکم جنوری 1975 کو کتب خانہ و ادارۂ تحقیق مخطوطات مشرقی کو تلنگانہ اسٹیٹ آرکائیوز ڈپاٹمنٹ سے علیحدہ کر دیا گیا اور اس کو محکمہ تعلیم کے انتظامی کنٹرول کے تحت خود مختار یعنی آزاد ڈائریکٹوریٹ بنایا گیا اس نقطہ نظر کے ساتھ کہ اسکالرز کے لئے مزید و بہتر تحقیقی سہولیات کو فراہم کر سکیں، اور کتب خانہ مخطوطات کو ایک جدید تحقیقی ادارے کے طور پر تیار کیا جائے۔

ادارہ کا محل وقوع: چونکہ ادارے کے پاس اپنی مستقل و علٰیحدہ عمارت دستیاب نہ تھی جس کے پیش نظر کتب خانہ و ادارہ تحقیق مخطوطات مشرقی کو افضل گنج میں واقع اسٹیٹ سنٹرل لائبریری عمارت کی پہلی منزل میں قائم کیا گیا تھا۔ 1980ء میں کتب خانہ و ادارۂ تحقیق مخطوطات مشرقی کو تارنا کا، حیدرآباد میں موجود اسٹیٹ آرکائیوز بلڈنگ میں منتقل کیا گیا ۔ چند سال یہ ادارہ اسٹیٹ آرکائیوز بلڈنگ میں ہی اپنا کام انجام دے رہا تھا بعد ازآں سال 1984ء میں یہ ادارہ رتن محل بلڈنگ ایبڈس میں کرایہ پر منتقل ہوا۔ بعد ازآں اس

ادارہ نے ریسرچ اسکالرز اور محققین کی سہولت کو کو مدنظر رکھتے ہوئے پھر سے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے زمین کولیس (رہن) پر لے کر اس پر ایک عمارت تعمیر کرائی اور 31 مارچ 1997ء میں اس نئی عمارت کی افتتاح عمل میں لائی گئی۔

مخطوطات کی ذخیرہ اندوزی: کتب خانہ و ادارۂ تحقیق مخطوطات مشرقی نے اپنی کوشش سے تقریباً 23 ہزار سے زائد نایاب مخطوطات کا ذخیرہ یکجا کیا ہے جو فارسی، عربی، اردو، انگریزی، ترکی، سنسکرت کے علاوہ تلگو، کنڑی، اور دیگر زبانوں میں موجود ہیں، جو کہ مختلف کاغذوں اور کھجور کے پتوں پر مشتمل ہیں۔ اوران اہم ترین و نایاب نسخہ جات کو جمع کرنے میں متعدد اسکالرز، اداروں اورت تنظیموں نے حصہ لیتے ہوئے اسکولزر نے اپنے ذاتی مخطوطات کا ایک گراں قدر عطیہ دیا اور اداروں اور تنظیموں نے حکومت کے حکم کے تحت اپنے نسخہ جات و مخطوطات کو کتب خانہ و ادارہ تحقیق مخطوطات مشرقی کو منتقل کیا۔ اس ادارے میں فارسی، عربی اور اردو کے تقریباً 17 ہزار سے زائد مخطوطات دورہ آصف جاہی میں اسٹیٹ سینٹرل لائبریری حیدرآباد (آصفیہ لائبریری) سے دریافت شدہ ہیں۔ اس ادارہ میں قرآن مجید کے نسخے، تفاسیر، حدیث، فقہ، فلسفہ، منطق، تصوف، تاریخ، ادب، شاعری، لغات اور سائنسی متون وغیرہ کی ہزاروں کی تعداد میں محفوظ ہیں۔ فارسی، اردو، عربی اور دیگر زبانوں کے مخطوطات اس ذخیرے کو مزید قیمتی بناتے ہیں۔

تحقیقی و علمی اہمیت: کتب خانہ و ادارۂ تحقیق مخطوطات مشرقی محققین کے لیے ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا بھر سے محققین یہاں آ کر مخطوطات سے استفادہ کرتے ہیں۔ محققین ان مخطوطات کی مدد سے متون کی تدوین، تصحیح اور تنقیدی اشاعت انجام دیتے ہیں، جو بغیر اصل نسخوں کے ممکن نہیں۔ مختلف مخطوطاتی نسخوں کے تقابلی مطالعے سے متن کی اغلاط کی نشاندہی اور مستند متن کی تشکیل کی جاتی ہے۔ بہت سی علمی تدوینات اور تحقیقی کام اسی تحقیقی ادارہ کے مخطوطات پر مبنی ہیں۔

کتب خانہ و ادارۂ تحقیق مخطوطات مشرقی حیدرآباد میں محفوظ یہ قیمتی و نایاب مخطوطات محض قدیم کاغذات یا تحریریں نہیں بلکہ ہمارے علمی، فکری، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی ورثے کے نہایت قیمتی خزانے ہیں۔ یہ مخطوطات محض ماضی کی یادگار نہیں بلکہ علم کی زندہ دستاویزات ہیں، جو مختلف فنون کی شکل میں ہم تک پہنچی ہیں۔ جو کہ ہمارے علمی تسلسل (Intellectual continuity) کو برقرار رکھتے ہیں۔ اگر ان کا تحفظ نہ کیا جائے تو نہ صرف نایاب علمی سرمایہ ضائع ہو جائیگا بلکہ آنے والی نسلیں بھی اپنے ماضی سے محروم ہو جائیں گی۔ کتب خانہ و ادارۂ تحقیق مخطوطات مشرقی حیدرآباد میں موجود مخطوطات ہمارے ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان ایک مضبوط کڑی ہے۔ ان کی قدر و قیمت کا ادراک، ان سے علمی استفادہ، ان کا تحفظ، معیاری و وضاحتی فہرست سازی اور ڈیجیٹلائزیشن دراصل ہماری قومی و تہذیبی ذمّہ داری ہے۔ ان اقدامات کے ذریعے محققین کو مستند مواد تک آسان رسائی حاصل ہو سکتی ہے اور یہ علمی خزانہ آئندہ نسلوں تک محفوظ طور پر منتقل کیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات: 1۔ اقبال، محمد افضل، ایم اے عثمانیہ حیدرآباد۔ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد کا ایک قدیم بین الاقوامی شہرت کا حامل کتب خانہ، برہان دہلی، جلد۔ ۶۶، شمارہ۔ ۶، (ربیع الثانی ۱۳۹۱ھ (مطابق ماہ جون ۱۹۷۱ء)، ص، ۴۲۱۔ ۴۰۷۔

۲۔ شرفی، حمید الدین۔ تاریخ حیدرآباد بہ سلسلہ تقاریب جشن چار سو سالہ حیدرآباد، سلسلہ مطبوعہ روزنامہ سیاست ۲۳، فروری ۱۹۹۴ء، ص ۶۴۔

۳۔ ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۶۲ء میں، سلسلہ مطبوعہ ۲۸۹، دفتر ادارہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد، ۱۹۶۲ء، ص۔ ۵۔

۴۔ راؤ، نرسمہا (چیف کمپائلر)، کماری، سرلا (کمپائلر)۔ ہینڈ بک آف آندھرا پردیش گورنمنٹ اورینٹل لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ، پہلا ایڈیشن: مارچ 1988ء، ص۔ ۱۔

۵ ۔ ہینڈ بک آوف آندھرا پردیش گورنمنٹ اورینٹل لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ،ص۔ا۔

کتابیات۔

1۔ راؤ، نرسمہا (چیف کمپائلر)، کماری، سرلا (کمپائلر) ۔ ہینڈ بک اوف آندھرا پردیش گورنمنٹ اور اورینٹل لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ، پہلا ایڈیشن: مارچ 1988، راؤ، نرسمہا لائبریری ڈائریکٹر، ماسٹر آرٹ پرنٹرز 1-1-694/2/A گاندھی نگر، حیدرآباد۔

2۔ اقبال، محمد افضل، ایم اے عثمانیہ حیدرآباد۔ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد کا ایک قدیم بین الاقوامی شہرت کا حامل کتب خانہ، برہان دہلی، جلد۔٦٦، شمارہ۔٦، ربیع الثانی ۱۳۹۱ھ ۔(مطابق ماہ جون ۱۹۷۱ء)۔

3 ۔ کرمی، مجتبیٰ ۔ نگاہی بہ تاریخ حیدرآباد دکن، پہلا ایڈیشن: ۱۳۷۳، تہران، دفتر مطالعات سیاسی و بین المللی ۔

4۔ رسول، مولوی غلام وصدیقی، مولوی محمد اکبر الدین و معتمد اعزازی کتب خانہ ادار؟ ادبیات اردو؟ فہرست مطبوعات کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو، جلد۔ا، جمال الدین، مولوی محمد، منتظم ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن، دارال طباعت، جنوری ۱۹۵٦ء۔

5۔ اقبال، افضل ایم اے ریسرچ اسکالر۔ تذکرۂ سعید، سلسلہ مطبوعہ۔ا، سعدیہ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد، اکسل فائن آرٹ پریس چوک، ۱۹۷۳ء۔

6۔ ادارۂ ادبیات اردو ۱۹٦۲ء میں، سلسلہ مطبوعہ۔۲۸۹، دفتر ادارہ، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد، ۱۹٦۲ء۔

7۔ شرفی، حمید الدین۔ تاریخ حیدرآباد بہ سلسلہ تقاریب جشن چارسو سالہ حیدرآباد، سلسلہ مطبوعہ روزنامہ سیاست ۲۳، انتخاب پریس حیدرآباد، فروری ۱۹۹۴ء۔

☆☆☆

Darbhanga ke pahle sahib-e-diwan shair Molvi Syed Abdul Wadood Bismil

by Dr. Abdul Wadood Qasmi (HOD, Urdu, K.S. College, Laheria Sarai

Darbhanga)cell-7979936725

ڈاکٹر عبدالودود قاسمیؔ (صدر شعبۂ اردو، کنور سنگھ کالج، لہیریا سرائے، دربھنگہ)

دربھنگہ کے پہلے صاحب دیوان شاعر مولوی سید عبدالودود بسملؔ

دربھنگہ صوبہ بہار کا قدیم ضلع وتاریخی شہر ہے اس کا دائرہ کافی وسیع ہے، جس میں پہلے کئی اضلاع تھے اب یہ ضلع سمٹ کر رہ گیا ہے۔ متھلا کی یہ سرزمین اپنی تہذیب وثقافت، رکھ رکھاؤ، کھان پان، اور علمی وادبی حوالے سے دنیا بھر میں مشہور ومقبول ہے۔ سرزمین دربھنگہ سے بڑے بڑے علماء، صوفیا اور شعرا پیدا ہوئے جن کی شہرت آج بھی مسلم ومستند ہے، دربھنگہ کی شعری وادبی روایت کا مستحکم سلسلہ میتھلی کے مشہور شاعر ودیاپتی، اور زبیر الدین گورگانی سے لے کر تا حال چل رہا ہے۔ معروف شاعر وادیب ڈاکٹر منصور عمر دربھنگہ کی شعری وادبی پس منظر سے متعلق لکھتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں اردو ادیب وفنکار نے کارہائے نمایاں انجام دیے لیکن طبیعت کے لاابالی پن، استغنا اور وسائل کی کمی کی وجہ سے بہت ہی کم مجموعہ کلام شائع ہو سکے مثلاً ''مسدس ثلاثہ کلاں'' (مرشد حسن کامل) 1888ء، ''چمنستان سخن'' (شہزادہ زبیر) 1898ء ''مثنوی در شہوار'' (شہزادہ زبیر) 1898ء ''دیوان بسمل'' (عبدالودود بسملؔ) 1904ء ''دیوان سعادت'' (نواب سعادت علی خاں پیغمبر پوری) 1907ء حسنات خیر، لمعات خیر، (خیر رحمانی بہیڑوی) غیر مطبوعہ

یہی وہ شعراء کرام ہیں جن میں سے بعض اور ان کے ہم عصروں نے اردو شاعری کے قافلے کو آگے بڑھایا۔" (سہ ماہی تمثیلِ نو۔مدیر اعزازی: ڈاکٹر امام اعظم ۔سال : جولائی تا دسمبر 2006ء۔صفحہ:55)

نوٹ: ڈاکٹر منصور عمر نے اپنے اس مضمون میں دیوان بسملؔ کی سال اشاعت 1904ء لکھا ہے جبکہ ''دیوان بسمل'' کے ٹائٹل صفحہ پر سال اشاعت :1905ء درج ہے۔

مذکورہ شعراء میں مولوی سید عبدالودود بسمل بھی ہیں جنہیں دربھنگہ کے پہلے صاحب دیوان ہونے کا شرف حاصل ہے۔عبدالودود بسملؔ کے والد محترم مولوی سید عبدالحئ جو کہ ذبیحؔ تخلص کرتے تھے اور مولوی سید محمد مرشد حسن کامل کے شاگرد تھے، دربھنگہ شہر کے قلب میں واقع محلہ میر منجن سے تعلق رکھتے تھے۔شعری وادبی ذوق حضرت بسملؔ کو اپنے علمی وادبی گھرانے سے ورثہ میں ملا تھا۔سید عبدالودود بسملؔ کے خاندانی پس منظر سے متعلق منشی بہاری لال فطرتؔ متھلانچل کی تہذیب وثقافت اور تاریخ پر مشتمل مشہور وقدیم کتاب تواریخ الفطرت معروف بہ'' آئینہ ترہت'' میں لکھتے ہیں اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''مولوی سید عبدالحئ ولد سید نبی بخش ساکن محلہ میر منجن متعلق دربھنگہ مرد شریف ونجیب عالی خاندان ہیں، علم صرف ونحو وفقہ وفرائض میں دخل رکھتے ہیں، اکثر مناسخہ لگانے میں اچھا دخل رکھتے ہیں، آدمی صاحب استعداد ہیں، صاحب اخلاق ہیں، ظاہر وضع سے ان کی ایک آزادانہ پن ٹپکتا ہے، شعر گوئی میں مولوی سید محمد مرشد حسن کاملؔ کے شاگرد ہیں، شعر اچھا کہتے ہیں راقم نے مشاعرہ میں ان کو شعر پڑھتے ہوئے دیکھا اور سنا ہے ذبیحؔ تخلص کرتے ہیں''۔(آئینۂ ترہت: مؤلف منشی بہاری لال فطرت۔صفحہ۔101)

درج بالا اقتباس سے اس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ مولوی عبدالودود بسملؔ دربھنگہ کے محلہ میر منجن کے رہنے والے تھے اور ان کے والد محترم مولوی سید عبدالحئ ذبیحؔ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔انہیں باتوں کی وضاحت حکیم سید احمد اللہ ندوی اپنی کتاب''

تذکرہ مسلم شعرائے بہار'' حصہ اول میں کرتے ہوئے بسملؔ کے چند اشعار بھی نقل کئے ہیں اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"مولوی عبدالودود خلف مولوی عبدالحی صاحب ساکن دربھنگہ عربی فارسی اور اردو میں کامل دستگاہ ہے، آدمی خلیق اور سلیم طبع ہیں، فن سخن میں جناب کامل سے تلمذ ہے۔ بسمل کے چند اشعار پیش نظر ہیں۔

نشیلی آنکھوں میں سرمہ لگائے بیٹھے ہیں — وہ آج فتنۂ محشر جگائے بیٹھے ہیں
کبھی تو زیر قدم ہو یہ فرش نورانی — تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں
بلانے پر بھی کیا خون آرزو اس نے — کہا یہ کہہ دو کہ مہندی لگائے بیٹھے ہیں
شبِ فراق میں کی ہے جو موت کی دعوت — چراغ داغ جگر وہ جلائے بیٹھے ہیں"

(تذکرہ مسلم شعرائے بہار: حصہ اول مؤلف: حکیم سید احمد اللہ ندوی صفحہ 145)

جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ سرزمین دربھنگہ کے پہلے خوش بخت شاعر مولوی سید عبدالودود بسملؔ ہیں جسے اللہ نے صاحب دیوان شاعر ہونے کا شرف اعزاز بخشا، اس دیوان کے مرتب و مدون مشہور صحافی، شاعر و ادیب جناب مولوی سید ابوالخیر صاحب خیر قاضی بھیڑوی دربھنگوی ایڈیٹر ''اخبار الپنچ'' بانکی پور، پٹنہ ہیں جنہوں نے اپنی نگرانی میں ''دیوان بسمل'' کو مطبع اخبار بانکی پور سے 1905ء میں شائع کیا۔ جو ایک سو پچیس صفحات پر مشتمل ہے، مذکورہ دیوان میں تقریباً ایک سو ستائیس غزلیں آٹھ رباعیات اور مختلف اساتذہ کی زمین میں بسمل کی کہی گئیں آٹھ خمسات (خمسہ غزلیں) ایک مسدس بطرز واسوخت کے علاوہ شعراء کے دیوان بسمل پر قطعات تاریخ شامل ہیں۔ دیوان کی شروعات حمد پاک سے ہوتی ہے شاعر اللہ سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے۔

عاشق شیدا ازل سے ہوں خدا کے نور کا — ہو سر دیوان عوض مطلع کے نقشہ طور کا
دھیان ہے فکر سخن میں اک رخ پر نور کا — مطلع روشن میرا مطلع ہے صبح طور کا
ہر شہید بدر کا دیتا ہوں تجھ کو واسطہ — یا الٰہی منہ نہ دکھلانا شب دیجور کا

کرتا ہوں ذکر پنجتن پاک اوڑھ کر بسملؔ بلند رتبہ ہے میرے کلیم کا

یوں تو حضرت بسملؔ نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی غزلیہ شاعری بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ان کی غزلوں میں رنگارنگ اور متنوع پہلوؤں کے عکس ونقوش کے ساتھ زندگی کے تمام مسائل پر اشعار مل جاتے ہیں، بسملؔ اپنی غزلوں میں اپنے محبوب کا ذکر بڑی ہمک کے ساتھ کرتے ہیں وہیں زمانے کی تیز رفتار، منافقانہ روش اور لوگوں کے سلوک، اخلاق واخلاص کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

تھے دلوں میں کبھی کیا کیا اخلاص آج دنیا میں ہے عنقا اخلاص
کہنے سننے کی ہیں باتیں ورنہ دوستی کیسی کہاں کا اخلاص
سچ میں کہتا ہوں خدا شاہد ہے آج باقی نہیں سچا اخلاص
اون سے کیا خاک ملے گا بسملؔ جب وہ باقی نہیں اگلا اخلاص

(دیوان بسملؔ: سید عبدالودود بسملؔ صفحہ۔32)

''دیوان بسملؔ'' میں غزل کے علاوہ رباعیات بھی شامل ہیں بطور نمونہ ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں۔جس میں شاعر کا لب ولہجہ تھوڑا تلخ اور طنز لیے ہوئے نظر آتا ہے۔ ؎

افلاس میں مہمان جو ہوا ماہِ صیام روزہ کے ثواب سے بھی رکھانا کام
غم کھاتا ہوں دن کو شب کی افطاری کا ہے نام کو میرا روزہ داروں میں نام

خلاصہ کلام یہ کہ مولوی سید عبدالودود بسملؔ اپنے زمانہ کے کہنہ مشق شاعر تھے اور اپنے معاصرین میں بہت ہی محبوب مقبول اور مستند تھے۔معاصر شعرا نے بھی ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف بڑے خلوص سے کیا ہے۔''دیوان بسملؔ'' میں آٹھ (۸) نامور اساتذۂ سخن نے دیوان کی ترتیب، طبع اور اشاعت پر قطعات تاریخ لکھا ہے۔طوالت سے بچتے ہوئے صرف ایک شاعر سید شاہ رحمت اللہ احقرؔ مظفر پوری کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

جب طبع ہوا کلام بسملؔ سُن سُن کے پھڑک اٹھے سخندان

اللہ رے فکر حسن عالی دیوان ہے برنگِ مہرتابان
یہ رنگ بیان یہ چست بندش کیونکر نہ ہو اک جہان قربان
احقرؔ کو ہوئی جو فکر تاریخ کچھ دیر رہا وہ اس میں حیران
یوں ہاتف غیب نے ندا دی لکھ گوہر نظم ہے یہ دیوان
1322ھ

میں اپنے اس مختصر مضمون کو اس اقتباس پر مکمل کرتا ہوں جسے معروف صحافی شاعر و ادیب و مرتب دیوان ابوالخیر مظہر عالم خیر قاضی بہیڑوی دربھنگوی نے دیوان میں شامل اپنی تحریر میں بسملؔ سے متعلق لکھتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"نظم ونثر اردو و فارسی میں یدطولیٰ تھا اور رات دن شعر و شاعری کا مشغلہ دربھنگہ اور اطراف کے لوگ آپ ہی سے نظم ونثر ہر قسم کی لکھواتے۔ ہر شخص کے وقت پر کام آتے۔ مرجع انام و ماوائے خاص و عام تھے۔ بعد فراغ تحصیل علوم وکالت کا امتحان دیا۔ اور آخر عمر تک عدالت منصفی دربھنگہ کی وکالت کرتے رہے۔ آپ نے نہایت ہی کم عمر پائی۔ شہر جمادی الاول 1311ھ ہجری مطابق 1893ء میں بعمر چہل سال و چند ماہ لاولد اس دنیائے ناپائدار سے دارالقرار کی طرف چل بسے اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کا کلام بیشمار ہر طرح کی نظم ونثر کا انبار اور دیوان ضخیم تھا۔ مگر دست بردر زمانہ سے محفوظ نہ رہا۔ جو کچھ بچ رہا تھا۔ ہدیہ ناظرین وشائقین ہے۔ امید ہے کہ شائقین پڑھ کر محفوظ ہونگے اور حضرت بسمل کے لئے دعائے خیر فرمائینگے۔ واللہ غفور الرحیم!"

☆☆☆

Urdu Zaban aur Jadid Technology : Masael, Imkanaat aur Mustaqbil (Ek Jame Tahzibi, Lesani aur Takniki Mutala by Hafiz Md. Anwar Mustafa (Secondary Teacher (Urdu BPSC) UMV Darbhanga) cell-8279714276

حافظ محمد انوار مصطفیٰ (سیکنڈری ٹیچر (اردو بی پی ایس سی) یو ایم وی کبیر چک، دربھنگہ

اردو زبان اور جدید ٹیکنالوجی: مسائل، امکانات اور مستقبل
(ایک جامع تہذیبی، لسانی اور تکنیکی مطالعہ)

.1 تمہید: ایک نئی تہذیبی جہت کا آغاز: زبان محض لفظوں کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک پوری تہذیب، تاریخ اور انسانی شعور کی امین ہوتی ہے۔ اردو زبان، جو اپنی شیرینی، لطافت اور علمی ثروت کے باعث دنیا کی بڑی زبانوں میں شمار ہوتی ہے، آج ایک ایسے تاریخی موڑ پر کھڑی ہے جہاں اسے "جدید ٹیکنالوجی" کے چیلنجز اور بے پناہ امکانات کا سامنا ہے۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ وہی زبانیں زندہ رہتی ہیں جو وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو قبول کرتی ہیں۔ اردو نے مغلوں کے شاہی درباروں سے نکل کر دکن کی وادیوں، دہلی کے کوچوں اور لکھنؤ کی محفلوں میں پرورش پائی۔ پھر بیسویں صدی میں اس نے چھاپہ خانے (Printing Press) کے ذریعے اپنی بقا کی جنگ لڑی۔ آج اکیسویں صدی میں اردو کا واسطہ "سلیکون چپس" اور "مصنوعی ذہانت" سے ہے۔ یہ سفر روایتی قلم اور دوات سے شروع ہو کر ڈیجیٹل اسکرینوں اور کلاؤڈ کمپیوٹنگ تک پہنچ چکا ہے، جو اردو کی لچک اور وسعت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

.2 کمپیوٹر اور اردو: ارتقائی مراحل: اردو کی ترویج میں کمپیوٹر کا کردار ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سفر کو ہم دو بڑے ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

الف: ان پیج (InPage) اور ڈیسک ٹاپ پبلشنگ:

1990 کی دہائی میں ان پیج' سافٹ ویئر کی آمد اردو صحافت اور کتابت میں ایک عظیم انقلاب ثابت ہوئی۔ اس سے پہلے اردو اخبارات اور کتابیں" کاتب" اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، جو ایک طویل اور صبر آزما کام تھا۔ ان پیج نے نستعلیق رسم الخط کو کمپیوٹر کے سانچے میں ڈھال کر طباعت کو آسان اور تیز تر بنا دیا۔ تاہم، اس کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اس کا مواد صرف اسی سافٹ ویئر میں پڑھا جا سکتا تھا اور انٹرنیٹ کی عالمی دنیا میں یہ مواد تلاش (Search) نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ب: یونیکوڈ (Unicode) کا عالمی انقلاب: یونیکوڈ کی آمد اردو کے لیے" آبِ حیات" ثابت ہوئی۔ اس ٹیکنالوجی نے اردو کے حروف کو ایک عالمی ڈیجیٹل کوڈ عطا کیا، جس کے بعد اردو کا انحصار کسی خاص سافٹ ویئر پر نہیں رہا۔ اب اردو حروف کو گوگل، فیس بک اور ٹویٹر جیسے عالمی پلیٹ فارمز پر براہِ راست پہچانا اور تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یونیکوڈ نے اردو کو ایک مقامی زبان سے نکال کر عالمی" سائبر زبان" بنا دیا ہے۔

.3 انٹرنیٹ اور اردو صحافت کا نیا عالمی منظر نامہ: انٹرنیٹ نے اردو صحافت کو جغرافیائی حدود کی قید سے آزاد کر دیا ہے۔

ڈیجیٹل اخبارات اور ای۔ پیپرز: اب کسی قاری کو اپنے پسندیدہ اخبار کے لیے صبح کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھا شخص اپنے موبائل پر پلک جھپکتے ہی تازہ ترین ایڈیشن پڑھ سکتا ہے۔ نیوز پورٹلز اور فوری خبر رسانی: بی بی سی اردو، انڈیپنڈنٹ اردو اور وائس آف امریکہ جیسے اداروں نے اردو صحافت میں تحقیق اور ملٹی میڈیا (ویڈیو، انفوگرافکس) کا نیا رجحان متعارف کرایا ہے۔ اب خبر صرف پڑھی نہیں جاتی بلکہ دیکھی اور سنی بھی جاتی ہے۔

.4 سوشل میڈیا: اردو کا عوامی اور نوجوان چہرہ: سوشل میڈیا نے اردو کو روایتی نقادوں اور ادیبوں کے حصار سے نکال کر براہِ راست عوام، بالخصوص نوجوان نسل تک پہنچا دیا ہے۔

اردو کی بورڈ اور موبائل ایپس: اسمارٹ فونز میں اردو کی بورڈز (Phonetic Keyboards) کی شمولیت نے عام آدمی کو یہ طاقت دی کہ وہ اپنی مادری زبان میں اپنے جذبات کا اظہار کر سکے۔

ڈیجیٹل مشاعرے اور ادبی مکالمے: فیس بک اور واٹس ایپ پر ہزاروں ایسے علمی اور ادبی گروپس موجود ہیں جہاں نو آموز شعراء کی اصلاح ہوتی ہے اور ادبی مباحثے ہوتے ہیں۔

یوٹیوب اور صوتی مواد: اردو پوڈ کاسٹ (Podcasts)، آڈیو بکس اور دستاویزی فلموں نے اردو کی صوتی مقبولیت کو ایک نئی جہت بخشی ہے۔ یوٹیوب پر اردو کے تعلیمی چینلز اردو کے ذریعے جدید علوم سیکھنے کا بڑا ذریعہ بن چکے ہیں۔

.5 مصنوعی ذہانت (AI) اور اردو: امکانات کا سمندر: مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) اردو کے لیے نئے امکانات کے وہ دروازے کھول رہی ہے جن کا تصور چند سال پہلے ممکن نہ تھا۔

چیٹ بوٹس اور تعامل (Interaction): چیٹ جی پی ٹی (ChatGPT) جیسے ماڈلز اب اردو میں نہ صرف بات کر سکتے ہیں بلکہ مضامین لکھنا، ترجمہ کرنا اور یہاں تک کہ شاعری کی بحروں کو سمجھنا بھی سیکھ رہے ہیں۔

مشینی ترجمہ (Machine Translation): گوگل ٹرانسلیٹ اور دیگر ایپس نے زبانوں کے درمیان حائل دیواریں گرا دی ہیں۔ اب انگریزی کے پیچیدہ سائنسی مضامین کا اردو ترجمہ ایک کلک پر دستیاب ہے، جس سے علم کی منتقلی کا عمل تیز ہو گیا ہے۔

آواز سے تحریر (Speech to Text): وہ لوگ جو ٹائپنگ میں مہارت نہیں رکھتے، اب اپنی آواز کے ذریعے اردو تحریر تیار کر سکتے ہیں۔ یہ سہولت محققین اور مصنفین کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔

.6 اردو رسم الخط کے سنگین مسائل اور چیلنجز: جہاں ٹیکنالوجی نے اردو کو وسعت دی ہے،

وہیں کچھ ایسے مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں جو اردو کی جڑوں کو متاثر کر رہے ہیں:

رومن اردو کا فتنہ: نئی نسل سوشل میڈیا پر اردو کو انگریزی حروف میں لکھ رہی ہے (مثلاً: "Main theek hoon")۔ یہ عمل اردو کے اصل رسم الخط "نستعلیق" کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے۔ اگر رسم الخط مٹ گیا تو ہماری صدیوں کی ادبی تاریخ تک رسائی ختم ہو جائے گی۔

نستعلیق کی تکنیکی پیچیدگی: ڈیجیٹل دنیا بنیادی طور پر "نسیخ" (Naskh) رسم الخط کے لیے بنائی گئی تھی کیونکہ وہ سیدھا اور سادہ ہے۔ اردو کا حسن "نستعلیق" میں ہے جو ٹیڑھا اور تہوں والا ہے۔ ویب پیجز پر نستعلیق کو رائج کرنا اب بھی ایک تکنیکی چیلنج ہے، جس کی وجہ سے اکثر ویب سائٹس پر اردو بدشکل نظر آتی ہے۔

.7 ڈیجیٹل لائبریری اور تحقیق کا جدید معیار:

تحقیق کے میدان میں ٹیکنالوجی نے وہ کام کر دکھایا ہے جو پہلے ناممکن تھا۔

ریختہ (Rekhta): ریختہ جیسی ویب سائٹس نے اردو کی لاکھوں نایاب کتابوں اور دیوانوں کو ڈیجیٹلائز کر دیا ہے۔ اب کسی نایاب نسخے کی تلاش میں لائبریریوں کے دھکے کھانے کی ضرورت نہیں رہی۔

تلاش کے انجن (Search Engines): اب کسی مخصوص لفظ، مصرعے یا تاریخی واقعے کو ہزاروں صفحات میں چند سیکنڈز میں تلاش کیا جا سکتا ہے، جس نے تحقیق کے معیار اور رفتار کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔

.8 اختتامیہ: اردو کا مستقبل اور ہماری ذمہ داری: اردو زبان کا مستقبل ٹیکنالوجی کے ساتھ مشروط ہو چکا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اردو ایک زندہ اور توانا زبان کے طور پر ابھرے تو ہمیں درج ذیل اقدامات کرنے ہوں گے:

جدید علوم کی منتقلی: ہمیں اردو میں سائنس، ٹیکنالوجی، میڈیکل اور معاشیات کا ڈیٹا بیس تیار کرنا ہوگا۔

رسم الخط کی حفاظت: نوجوانوں میں نستعلیق کی بورڈ کے استعمال کو فروغ دینا ہوگا۔

مقامی ایپس کی تیاری: اردو میں ایسی ایپس اور گیمز بنانی ہوں گی جو بچوں کو اپنی زبان سے قریب رکھیں۔

خلاصہ یہ کہ ٹیکنالوجی اردو کو ختم کرنے کا خطرہ نہیں بلکہ اسے پوری دنیا میں پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، تو اردو نہ صرف برصغیر بلکہ عالمی سطح پر ایک بڑی ڈیجیٹل زبان بن کر ابھرے گی۔ اردو کا سورج اب ڈیجیٹل افق پر طلوع ہو رہا ہے، اور اس کی روشنی رہتی دنیا تک فکر و شعور کی راہوں کو منور کرتی رہے گی۔

☆☆☆

Urdu Dr. APJ Abdul Kalam : Khwabon ka Saudagar aur Insaniyat ka Alambardar (Ek Mufassal Sawanehi, Ilmi aur Fikri Mutala by Hafiz Md. Anwar Mustafa (Secondary Teacher (Urdu BPSC) UMV Darbhanga) cell-8279714276

حافظ محمد انوار مصطفیٰ (سیکنڈری ٹیچر (اردو بی پی ایس سی) یو ایم وی کبیر چک، دربھنگہ

ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام: خوابوں کا سوداگر اور انسانیت کا علمبردار

(ایک مفصل سوانحی، علمی اور فکری مطالعہ)

.1 تمہید: ایک عہد ساز شخصیت کا ظہور:

تاریخِ انسانی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے عہد کی پہچان بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اوول پاکر زین العابدین عبدالکلام (APJ Abdul Kalam) ایک ایسی ہی ہمہ جہت شخصیت تھے۔ وہ محض ایک سائنسی ذہن نہیں تھے، بلکہ وہ ایک درویش صفت انسان، ایک بہترین معلم اور ایک وژنری لیڈر تھے۔ جزیرہ رامیشورم کے ایک سادہ سے مچھیرے کے گھر سے شروع ہونے والا یہ سفر، دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے ایوانِ صدر تک کیسے پہنچا؟ یہ ایک ایسی کہانی ہے جو ہر اس شخص کے لیے مشعلِ راہ ہے جو حالات کی تنگی کا رونا روتا ہے۔ کلام صاحب نے ثابت کیا کہ اگر ارادے بلند ہوں اور نیت میں خلوص ہو تو منزل خود قدم چومتی ہے۔

.2 بچپن کی جدوجہد: اخبار بیچنے سے علم کی پیاس تک: ڈاکٹر کلام 15 اکتوبر 1931 کو پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن غربت میں گزرا لیکن محرومی میں نہیں۔ ان کے والد ایک مذہبی اور سادہ مزاج انسان تھے جو اپنی کشتی کے ذریعے زائرین کو رامیشورم لایا لے جایا کرتے تھے۔ کلام صاحب نے بچپن میں ہی محنت کی عظمت کو سمجھ لیا تھا۔ وہ فجر کی نماز کے بعد

ریلوے اسٹیشن جاتے، اخبارات کا بنڈل لیتے اور پورے شہر میں تقسیم کرتے تا کہ اپنی تعلیم کا خرچہ اٹھا سکیں۔ان کی تربیت میں ان کی والدہ اشی اما کا بڑا ہاتھ تھا، جنہوں نے انہیں سخاوت اور ہمدردی سکھائی۔ کلام صاحب اکثر یاد کرتے تھے کہ ان کی ماں اپنی روٹی کا حصہ بھی انہیں دے دیتی تھیں تا کہ ان کا بیٹا بھوکا نہ رہے اور جی لگا کر پڑھے۔

.3 ڈاکٹر کلام اور رمضان: روحانیت کا رنگ: آپ نے کلام صاحب کے رمضان اور عبادات کے بارے میں پوچھا۔ ان کی زندگی میں اسلام ایک زبردست روحانی قوت بن کر موجود تھا، لیکن اس میں کوئی دکھاوا نہیں تھا۔

رمضان کے معمولات: صدارت کے دوران بھی وہ سحری میں دہی، کھجور اور سادہ سالن پسند کرتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ روزہ محض بھوکا رہنے کا نام نہیں بلکہ یہ نظم وضبط اور صبر کا سبق ہے۔

ایوانِ صدر کی تاریخی تبدیلی: جب انہوں نے ایوانِ صدر میں افطار پارٹیوں پر ہونے والے لاکھوں روپے کے عوامی خرچے کو روک کر اسے مستحق یتیم خانوں کو بھیجنے کا حکم دیا، تو یہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک انوکھا قدم تھا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ مذہب کا اصل جوہر انسانیت کی خدمت ہے، نہ کہ شاہانہ ضیافتیں۔

قرآن فہمی: وہ قرآن مجید کے مطالعے کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ سمجھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ کائنات کے مادی قوانین (سائنس) اور کائنات کے خالق کے قوانین (دین) میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

.4 سائنسی فتوحات: میزائل مین کا عروج: ڈاکٹر کلام کی سائنسی خدمات نے ہندوستان کو دنیا کی صفِ اول میں لا کھڑا کیا۔

اسرو (ISRO) کا دور: انہوں نے SLV-3 پروجیکٹ کی قیادت کی، جس نے ہندوستان کو خلا میں سیٹلائٹ بھیجنے کی صلاحیت عطا کی۔

میزائل پروگرام (IGMDP): کلام صاحب کے وژن کے تحت اگنی'، 'پرتھوی' اور

آکاش' جیسے میزائل بنے۔انہوں نے ہندوستان کو دفاعی طور پر اتنا مضبوط کر دیا کہ کوئی دشمن میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔

پوکھران۔2:1998 کے ایٹمی تجربات کے وقت وہ ملک کے سب سے بڑے سائنسی مشیر تھے۔ان کی قیادت میں ہندوستان نے دنیا کو دکھا دیا کہ وہ اب ایٹمی کلب کا حصہ ہے۔

.5 بین الاقوامی اسفار: ایک عالمی سفیر کا سفرنامہ: ڈاکٹر کلام نے دنیا کے کئی ممالک کے دورے کیے،لیکن ان کا ہر دورہ علم 'اور امن' کا دورہ تھا۔

سوئٹزرلینڈ کا دورہ:2005 میں جب وہ سوئٹزرلینڈ گئے،تو ان کے احترام میں وہاں کی حکومت نے 26 مئی کو سائنس ڈے '(Science Day) قرار دے دیا۔ یہ کسی ہندوستانی کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔

جنوبی افریقہ اور نیلسن منڈیلا: کلام صاحب نے جب جنوبی افریقہ کا دورہ کیا تو انہوں نے رابن آئی لینڈ کا دورہ کیا جہاں نیلسن منڈیلا قید رہے۔ وہاں انہوں نے انسانی حقوق اور آزادی کے حق میں ایک عظیم تقریر کی۔

یورپی پارلیمنٹ: 2007 میں انہوں نے یورپی پارلیمنٹ سے خطاب کیا، جہاں انہوں نے" عالمی امن" اور" انسانیت کے اتحاد" کا فلسفہ پیش کیا۔ان کی تقریر کے بعد یورپی ارکان نے کھڑے ہو کر انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔

.6 ڈاکٹر کلام کی علمی وراثت: اہم کتابوں کا تذکرہ: ڈاکٹر کلام ایک عظیم مصنف بھی تھے۔ انہوں نے اپنی کتب کے ذریعے لاکھوں نوجوانوں کے ذہنوں میں چنگاری پیدا کی۔

ونگز آف فائر (Wings of Fire): یہ محض ایک آپ بیتی نہیں بلکہ جدوجہد کا ایک مکمل نقشہ ہے۔اس کتاب کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

اگنیٹیڈ مائنڈز (Ignited Minds): اس کتاب میں انہوں نے پوچھا کہ " ہندوستان کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ہم پیچھے کیوں ہیں؟"اور پھر نوجوانوں کو

راستہ دکھایا۔

انڈیا 2020 (India 2020): یہ ایک ترقی یافتہ ہندوستان کا وژن دستاویز تھا۔ انہوں نے زراعت، ٹیکنالوجی اور تعلیم کے ذریعے ملک کو آگے لے جانے کا پلان دیا۔

ٹرانسیڈنس (Transcendence): اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے پرمکھ سوامی جی کے ساتھ اپنے روحانی تجربات پر یہ کتاب لکھی، جو بین المذاہب ہم آہنگی کی بہترین مثال ہے۔

.7 سادگی کا وہ واقعہ جو دل جیت لے: کلام صاحب کی سادگی کے سینکڑوں قصے ہیں، لیکن ان کے رشتہ داروں والا واقعہ سب سے مشہور ہے۔ صدارت کے دوران جب ان کا خاندان دہلی آیا، تو انہوں نے سرکاری باورچی خانے سے ایک کپ چائے تک ان کے لیے نہیں منگوائی۔ یہاں تک کہ جب وہ صدر کے عہدے سے فارغ ہوئے، تو ان کے پاس لے جانے کے لیے صرف دو سوٹ کیس تھے، جن میں چند کپڑے اور زیادہ تر کتابیں تھیں۔

.8 بچوں سے عشق: ایک استاد کی آخری تمنا: کلام صاحب سے جب پوچھا گیا کہ وہ کس طرح یاد رکھا جانا پسند کریں گے؟ تو انہوں نے کہا: "ایک استاد کے طور پر"۔ وہ بچوں سے گھنٹوں باتیں کرتے، ان کے سوالوں کے جواب دیتے اور انہیں بڑے خواب دیکھنے کی ترغیب دیتے۔ ان کا کہنا تھا کہ " بچے ملک کا مستقبل نہیں بلکہ حال ہیں، ہمیں انہیں ابھی سے تیار کرنا ہوگا"۔

.9 وفات: ڈیوٹی پر رہتے ہوئے شہادت: 27 جولائی 2015 کی شام، شیلانگ میں وہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر طلبہ کو" ہم رہنے کے قابل زمین کیسے بنائیں" پر لیکچر دے رہے تھے کہ اچانک گرے اور پھر نہ اٹھ سکے۔ وہ علم بانٹتے ہوئے رخصت ہوئے۔ یہ ایک ایسی موت تھی جس کی تمنا ہر عالم کرتا ہے۔

.10 اختتامیہ: کلام کا پیغام اور ہماری ذمہ داری: ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی زندگی

ہمیں سکھاتی ہے کہ اگر آپ سورج کی طرح چمکنا چاہتے ہیں تو پہلے سورج کی طرح جلنا سیکھیں۔ وہ ایک سچے مسلمان تھے جنہوں نے اسلام کے امن اور خدمت کے پیغام کو عام کیا۔ وہ ایک سچے ہندوستانی تھے جنہوں نے ملک کے دفاع کو ناقابلِ تسخیر بنایا۔

آج جب ہم ان کے بارے میں پڑھتے ہیں تو ہمیں عہد کرنا چاہیے کہ ہم ان کے ادھورے خوابوں کو پورا کریں گے۔ ان کا پیغام تھا: "خواب دیکھو، خواب دیکھو، کیونکہ خواب ہی خیال بنتے ہیں اور خیال ہی عمل میں ڈھلتے ہیں"

☆☆☆

Feminine consciousness and Resistance in the Short Stories of Ismat chughtai

by Nusrat Shaheen (Lecturer, dept. of Urdu, Matiaburj college,Kolkata)

نصرت شاہین (لکچرار،شعبہء اردو،مٹیابرج کالج،کولکاتا) cell-7003786650

عصمت چغتائی کے افسانوں میں نسوانی شعور اور مزاحمت

Abstract:

Short story writing is regarded as an important genre in Urdu literature through which writers portray various aspects of social life in a realistic manner. In the twentieth century, particularly with the rise of the Progressive,Writers Movement, greater attention was given to issues related to women and marginalized groups. Among the prominent writers of this period, Ismat Chughtai holds a significant position. Her stories portray the inner experiences of women, social oppression, and subtle forms of resistance. This article examines feminist consciousness in selected stories such as Genda, Bichhu Phuphi, Chauthi Ka joda and Lihaaf highlighting women's psychological struggles, social realities, and their search for identity. The study concludes that Ismat Chughtai played an important role in

highlighting women's experiences in Urdu fiction and contributed significantly to the development of social awareness in literature.

اردو ادب میں افسانہ نگاری ایک اہم اور مؤثر صنف کے طور پر تسلیم کی جاتی ہے جس کے ذریعے ادیبوں نے معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ بیسویں صدی میں جب اردو ادب میں ترقی پسند تحریک نے فروغ پایا تو سماج کے نچلے طبقات اور خواتین سے متعلق موضوعات کو بھی بھرپور توجہ دی جانے لگی۔ اس دور میں کئی اہم افسانہ نگار سامنے آئے جنہوں نے عورت کے مسائل، اس کی زندگی، احساسات اور معاشرتی رکاوٹوں کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ ان افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں عورت کی داخلی کیفیات، سماجی جبر اور اس کے خلاف مزاحمت کو نہایت جرت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ عصمت چغتائی کے افسانوں میں نسوانی شعور واضح طور پر دکھائی دیتا ہے جہاں عورت اپنی شناخت، حقوق اور آزادی کے لیے جدوجہد کرتی نظر آتی ہے۔

اس مضمون کا بنیادی مقصد عصمت چغتائی کے افسانوں میں نسوانی شعور کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینا ہے۔ اس تحقیق میں ان کے منتخب افسانوں ''گیندا''، ''چوتھی کا جوڑا'' "بچھو پھوپھی" اور "لحاف" '' کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا جائے گا تاکہ واضح کیا جا سکے کہ ان کہانیوں میں کس طرح عورت کی نفسیاتی کیفیات، سماجی مسائل اور اس کی شناخت کے سوال کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اس مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عصمت چغتائی نے اردو ادب میں نسوانی شعور کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور ان کی تحریریں نہ صرف ادبی لحاظ سے اہم ہیں بلکہ سماجی شعور کی بیداری میں بھی نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔

Keywords:

Ismat Chughtai, Feminist Consciousness, Women Issues, Social Oppression, Urdu Short Stories.

ادب کسی بھی معاشرے کی فکری اور سماجی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے معاشرتی اقدار انسانی جذبات اور سماجی تضادات اکثر ادبی تخلیقات کے ذریعے زیادہ واضح انداز میں سامنے آتے ھیں اردو ادب میں افسانہ نگاری ایسی ہی ایک موثر صنف ہے جس نے مختصر مگر جامع انداز میں انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل اور معاشرتی حقیقتوں کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے۔ خاص طور پر بیسویں صدی میں اردو افسانے نے ایک نئی فکری اور فنی سمت اختیار کی جس میں معاشرتی ناانصافیوں، طبقاتی فرق اور عورت کی زندگی سے متعلق مسائل کو نمایاں طور پر موضوع بنایا ہے گیا۔ اسی دور میں اردو افستانے کو چند ایسے ادیب میسر آئے جنہوں نے نہ صرف اس صنف کو فنی اعتبار سے وسعت دی بلکہ اسے ایک مضبوط سماجی شعور سے بھی ہم آہنگ کیا۔ ان افسانہ نگاروں میں عصمت چغتاں ی کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عصمت نے اپنے افسانوں میں عورت کی زندگی کے ان پہلوؤں کو موضوع بنایا جن پر اس سے پہلے کم ہی توجہ دی گئی تھی۔ انکی تحریروں میں عورت کی داخلی کیفیات، اسکے خدمات اور معاشرتی پابندیوں کے خلاف اس کے ارد عمل کو بڑی بے پاکی اور حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انکے یہاں عورت محض ایک مظلوم کردار نہیں بلکہ ایک باشعور اور حساس شخصیت کے طور پر سامنے آتی ہے جو اپنے وجود اور شناخت کا احساس رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکے افسانوں میں نسوانی شعور اور سماجی مزاحمت کے عناصر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں زیر نظر مقالے میں عصمت چغتائی کے منتخب افسانوں کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے یہ جائزہ لیا جائے گا کہ انکی افسانہ نگاری میں عورت کے شعور اور اسکی سماجی جدوجہد کو کس طرح پیش کیا گیا ہے۔

عصمت چغتائی کے افسانوں میں نسوانی شعور: عصمت چغتائی اردو افسانے کی ایک

جراءت منداور منفرد افسانہ نگار ہیں۔ جنہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے عورت کے داخل کیفیات، معاشرتی پابندیوں اور صنفی ناانصافیوں کو نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ انکی افسانہ نگاری کا بنیادی موضوع عورت کی زندگی، اسکے جذبات اور اسکے سماجی مسائل ہیں۔ عصمت نے ان مسائل کو محض بیان ہی نہیں کیا بلکہ عورت کے شعور، اسکی کشمکش اور اسکی خود آگہی کو بھی نمایاں کیا ہے۔ عصمت کے افسانوں میں عورت صرف ایک مظلوم کردار کے طور پر سامنے نہیں آتی بلکہ وہ اپنے حالات کو سمجھنے اور ان کے خلاف آواز اٹھانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی افسانہ نگاری اردو ادب میں نسوانی شعور کے اظہار کی ایک اہم مثال سمجھی جاتی ہے۔ انکی تحریروں میں عورت کی خواہشات سماجی روکاوٹیں اور محدود آزادی اسکے اندرونی مخالفت کے جذبات کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں. عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے بیشتر افسانے محض تخیّل کی پیداوار نہیں بلکہ زندگی کے حقیقی مشاہدات اور ذاتی تجربات سے وابستہ ہیں۔ خصوصاً عورتوں کی زندگی، ان کے مسائل اور گھریلو و معاشرتی حالات کو انہوں نے قریب سے دیکھا اور محسوس کیا، جس کے باعث ان کی تحریروں میں حقیقت پسندی اور تجرباتی صداقت نمایاں نظر آتی ہے۔ اسی حوالے سے ایک انٹرویو میں عصمت اپنی کہانیوں کی تخلیقی بنیاد کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتی ہیں:

"میری کوئی کہانی تخیل کی پیداوار نہیں۔ جب کوئی مسئلہ دماغ میں الجھ جاتا ہے تو اک بے نام سی خلش ہوتی ہے اور کہانی کی صورت میں ایک بوجھ سا دل سے اُتر جاتا ہے۔ وہ جسے کیفیت کہتے ہیں انسان کے دل میں اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وکسی واقعہ یا پابندی سے متاثر ہوتا ہے جھنجلاہٹ، غصہ، غم اور مختلف جذبات ابھرتے ہیں اور میرا تجربہ ہی ہے کہ کہانی یا مضموں کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کر دینے سے نسبتا سکون مل جاتا ہے " (عصمت چغتائی سے ایک ملاقات " انٹرویو از جلیل بازید پوری - ماہنامہ شیرازہ سری نگر، جلد 30، شمارہ 10 / 8 ص 28 بحوالہ: جگدیش چندر ودھان، عصمت

چغتائی: شخصیت اور فن. ص,201)

یہ اقتباس اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری محض تخیلاتی دنیا کی پیداوار نہیں بلکہ ان کے ذاتی مشاہدات اور معاشرتی تجربات کا عکس ہے۔ خصوصاً عورتوں کی زندگی سے متعلق مسائل، گھریلو جبر، معاشرتی پابندیاں اور جذباتی پیچیدگیاں ان کے افسانوں میں اس لیے شدت کے ساتھ سامنے آتی ہیں کہ مصنفہ نے انہیں قریب سے محسوس کیا تھا۔ یہی ذاتی تجربات ان کے ہاں نسوانی شعور کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور عورت کے باطن میں موجود احساسات، محرومیوں اور ردِعمل کو حقیقت پسندانہ انداز میں نمایاں کرتے ہیں۔ چنانچہ عصمت چغتائی کے افسانے عورت کی زندگی کے ان گوشوں کو آشکار کرتے ہیں جو طویل عرصے تک ادبی بیانیے میں نظر انداز کیے جاتے رہے۔

اس بحث کی پہلی کڑی افسانہ " گیندا" ہے۔ اس افسانے میں عصمت چغتائی نے نچلے طبقے کی عورت کی زندگی اور اس کے ساتھ ہونے والی معاشرتی ناانصافی کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ گیندا کا کردار ایک ایسی لڑکی کی نمائندگی کرتا ہے جو کم عمری میں ہی سماجی استحصال اور محرومیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

افسانہ گیندا کی بیانیہ ساخت میں متکلم محض ایک ناظر یا راوی کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ خود بھی اس کہانی کے داخلی منظرنامے کا حصہ ہے۔ گیندا اس کی سہیلی ہے. افسانے کے یہ دونوں کردار عمر کے اس ابتدائی مرحلے میں واقع ہیں جہاں شعوری پختگی ابھی تشکیل کے عمل سے گزر رہی ہوتی ہے. زندگی کے پیچیدہ حقائق اور اس کے تلخ تجربات کا ادراک ابھی ممکن نہیں ہوتا، چنانچہ ان کی گفتگو میں بار بار حیرت، استعجاب اور سوالیہ کیفیت کا اظہار ملتا ہے۔ اس افسانے میں مصنفہ نے معاشرتی زندگی کی ان تلخ اور پوشیدہ حقیقتوں کو آشکار کرنے کی جرات مندانہ کوشش کی ہے جن کے بارے میں عموماً آگاہی کے باوجود اظہار سے احتراز کیا جاتا ہے۔ عصمت چغتائی نے ان حساس پہلوؤں کو بے خوفی اور بے باکی

کے ساتھ بیان کر کے نہ صرف ادبی روایت کو وسعت دی بلکہ معاشرتی منافقت کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہوں:

"میں اُسے ٹاٹ پر لئے بیٹھی رہی اور گیندا نے مجھے لاکھوں کروڑوں عجیب عجیب باتیں بتائیں۔ کسی طرح وہ مہینوں ماری گئی۔ چودہ پندرہ برس کی گیندا خود بھی بہت سی باتیں نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے کیسے بتاتی۔ ہم دونوں ''کیوں، کیسے'' اور ''ارے پر آ کر رک جاتے.."

(عصمت چغتائی کے افسانے، جلد اول، لاہور، کتابی دنیا، 2006، ص، 13)

اس اقتباس میں متکلم اور گیندا کے درمیان ہونے والی گفتگو نہایت معنی خیز انداز میں پیش کی گئی ہے۔ بظاہر یہ ایک سادہ اور معصوم مکالمہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے پس منظر میں پوشیدہ سماجی حقیقتیں قاری کو گہرے تاثر سے دوچار کرتی ہیں۔ گیندا اپنی زندگی کے تجربات اور محرومیوں کو جس سادگی کے ساتھ بیان کرتی ہے، وہ دراصل اس طبقاتی اور معاشرتی نظام کی طرف اشارہ ہے جہاں کم سن لڑکیاں حالات کے جبر کا شکار ہو کر وقت سے پہلے زندگی کی سختیوں سے آشنا ہو جاتی ہیں۔ متکلم اور گیندا کی گفتگو کا بار بار "کیوں" "کیسے" اور "ارے" پر آ کر رک جانا اس امر کی علامت ہے کہ دونوں اس پیچیدہ معاشرتی حقیقت کو پوری طرح سمجھنے یا بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ عصمت چغتائی نہایت باریک بینی سے اس معاشرتی المیے کو اجاگر کرتی ہیں جس میں عورت کی زندگی کے مسائل محض ذاتی نہیں بلکہ پورے سماجی ڈھانچے سے وابستہ نظر آتے ہیں۔

عصمت چغتائی کا افسانہ "چوتھی کا جوڑا" اس ضمن کی ایک ناقابل فراموش کڑی ہے۔ یہ افسانہ اس سماجی نظام کی گہری تنقید پیش کرتا ہے جس میں عورت کی زندگی کو شادی اور اس سے وابستہ رسم و رواج تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار کبریٰ ایک ایسی لڑکی ہے جس کی عمر گزرتی جا رہی ہے مگر اس کی شادی نہیں ہو پاتی، جس کے باعث گھر کا ماحول مسلسل اضطراب اور تشویش کا شکار رہتا ہے۔ کبریٰ کی ماں اپنی تمام تر توجہ بیٹی کی شادی اور خاص طور پر چوتھی کے جوڑے کی تیاری پر مرکوز رکھتی ہے، گویا ایک لڑکی

کی زندگی کی کامیابی کا معیار صرف اس کی شادی ہی ہے۔

افسانہ چوتھی کا جوڑا میں عصمت چغتائی نے متوسط طبقے کی گھریلو زندگی اور اس میں موجود جذباتی کشمکش کو نہایت باریک بینی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خاص طور پر کبریٰ کی شخصیت ایک ایسے کردار کے طور پر سامنے آتی ہے جس کی زندگی امید اور محرومی کے درمیان معلق دکھائی دیتی ہے۔ شادی کے خواب اور اس سے وابستہ سماجی توقعات اس کے ذہن پر اس قدر حاوی ہیں کہ وہ اپنی پوری زندگی کو اسی امید کے گرد ترتیب دیتی ہے۔ مگر حالات کا جبر اور معاشرتی رویّے اس خواب کو ایک تلخ انجام کی طرف لے جاتے ہیں۔ اسی کیفیت کی ایک جھلک درج ذیل اقتباس میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

" کفن کے لٹھے کی کان نکال کر انہوں نے چوہرا تہہ کیا اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج اُن کے چہرے پر بھیا تک سکون اور موت بھرا اطمینان تھا جیسے انہیں پکا یقین ہو کہ اور جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سنیتا نہ جائے گا"

(عصمت چغتائی کے افسانے، جلد دوم، لاہور، کتابی دنیا، 2013، ص، 321)

یہ اقتباس دراصل کہانی کے اس المناک موڑ کو نمایاں کرتا ہے جہاں شادی اور خوشی کی علامتیں یکا یک غم اور محرومی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ مصنفہ نے نہایت مؤثر علامتی انداز میں دکھایا ہے کہ جس زندگی کو سماج نے صرف شادی کی کامیابی سے مشروط کر دیا تھا، وہی خواب آخرکار ایک المیے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس منظر کے ذریعے واضح ہوتا ہے کہ عورت کی خواہشات اور اس کی تقدیر اکثر سماجی اقدار اور مردانہ رویّوں کے ہاتھوں کس طرح پامال ہو جاتی ہے۔

عصمت چغتائی کا افسانہ بچھو" پھوپھی " نسوانی شعور اور بے باکی کی بہترین مثال ہے. یہ افسانہ ایک ایسی عورت کے کردار کے گرد گھومتا ہے جسے گھر کے لوگ طنزیہ طور پر'' بچھو پھوپھی'' کہتے ہیں۔ وہ تیز مزاج، بے باک اور کسی حد تک سخت طبیعت کی مالک دکھائی دیتی ہے، اسی لیے خاندان کے اکثر افراد اس سے خائف بھی رہتے ہیں اور

اس کی باتوں کو طنز اور سختی سے تعبیر کرتے ہیں۔ بچھو پھوپھی کی زندگی دراصل محرومیوں اور تلخ تجربات سے عبارت رہی ہے، جس نے اس کی شخصیت میں ایک طرح کی سختی اور کڑواہٹ پیدا کر دی ہے۔ بچھو پھوپھی اپنے بھائی کے گھر کے ماحول اور دیگر گھریلو معاملات میں اکثر مداخلت کرتی ہے اور اپنے اندازِ گفتگو سے لوگوں کو چونکا دیتی ہے۔ تاہم اس کے اس رویّے کے پیچھے محض تلخی نہیں بلکہ زندگی کے تجربات اور سماج کے خلاف ایک طرح کی داخلی مزاحمت بھی کارفرما ہے۔ وہ روایتی نسوانی کردار کی طرح خاموش اور مطیع بن کر رہنے کے بجائے کھل کر اپنی بات کہتی ہے اور یہی بات اسے گھر کے دوسرے افراد سے مختلف بنا دیتی ہے۔ اس افسانے میں عصمت چغتائی نے نہایت باریک بینی سے ایک ایسی عورت کی نفسیات کو پیش کیا ہے جو معاشرتی روایات کے دباؤ کے باوجود اپنی شخصیت اور رائے کا اظہار کرنے سے نہیں گھبراتی۔ اس طرح بچھو پھوپھی کا کردار ایک طرف طنز و مزاح کا پہلو رکھتا ہے تو دوسری طرف عورت کی خودمختاری اور داخلی مزاحمت کی علامت بھی بن جاتا ہے۔

افسانہ "بچھو پھوپھی" کے اختتامی حصے میں کہانی ایک نہایت جذباتی اور نفسیاتی موڑ اختیار کر لیتی ہے۔ بچھو پھوپھی، جو اپنی تند خوئی، خودداری اور خاندانی رنجشوں کے باعث برسوں تک اپنے بھائی سے دور رہی تھیں، اچانک اس وقت اندرونی اضطراب کا شکار ہو جاتی ہیں جب انہیں بھائی کی نازک حالت کی خبر ملتی ہے۔ عمر بھر کی خفگی اور دل کی کدورتیں ایک لمحے کے لیے پس منظر میں چلی جاتی ہیں اور بہن کے رشتے کی فطری کشش غالب آ جاتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب بچھو پھوپھی کے باطن میں پوشیدہ نرم جذبات پہلی مرتبہ پوری شدت کے ساتھ آشکار ہوتے ہیں، اور قاری ان کی شخصیت کے ایک نئے اور غیر متوقع پہلو سے آشنا ہوتا ہے۔ اس کیفیت کو عصمت چغتائی نے نہایت مؤثر اور علامتی انداز میں یوں پیش کیا ہے:

"پھوپھی بادشاہی باوجود بالوں کے وہی منی سی بچھو لگ رہی تھیں جو بچپن میں بھائیوں سے

مچل کر بات منوالیا کرتی تھیں۔ان کی شیر جیسی خرانٹ آنکھیں ایک میمنے کی معصوم آنکھوں کی طرح سہمی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے آنسوان کے سنگ مرمر کی چٹان جیسے گالوں پر بہہ رہے تھے"

(دو ہاتھ "عصمت چغتائی، لاہور، یوسف ظفر,1966 ص،193)

یہ اقتباس دراصل بچھو پھوپھی کی شخصیت کے داخلی تضادات اور جذباتی پیچیدگیوں کونمایاں کرتا ہے۔ظاہری سختی اور تیکھے لہجے کے باوجود ان کے باطن میں محبت اور خاندانی وابستگی کی ایک گہری لہر موجود ہے، جوفیصلہ کن لمحے میں پوری شدت کے ساتھ ابھر آتی ہے۔یوں افسانے کا یہ حصہ نہ صرف کردار کی نفسیاتی گہرائی کو اجاگر کرتا ہے بلکہ انسانی جذبات کی پیچیدہ ساخت کو بھی نہایت مؤثر انداز میں سامنے لاتا ہے۔

عصمت چغتائی کا افسانہ "لحاف" اپنی بے باکی اور حقیقت نگاری کے باعث اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔اس افسانے نے اس زمانے میں بڑی بحث چھیڑ دی تھی اور اسی وجہ سے عصمت پر فحاشی کا مقدمہ بھی چلایا گیا،مگر وہ عدالت سے بری ہوگئیں۔افسانہ''لحاف''اردو افسانوی ادب میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے،جس کی بنیادی وجہ اس کا جرات مندانہ موضوع اور علامتی اسلوبِ بیان ہے۔

افسانے میں لحاف صرف ایک بستر کا حصہ نہیں بلکہ ایک علامت کے طور پر سامنے آتا ہے جوان پوشیدہ جذبات اور دبی ہوئی خواہشات کی نمائندگی کرتا ہے جنہیں معاشرہ کھل کرتسلیم کرنے سے کتراتا ہے۔کم عمر راوی کی معصوم نگاہوں سے پیش کیے گئے واقعات اس کہانی کوایک خاص نفسیاتی گہرائی عطا کرتے ہیں، کیونکہ وہ بہت سی باتوں کو دیکھتی تو ہے مگر ان کی اصل حقیقت کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتی۔اس طرح مصنفہ نے نہایت باریک بینی سے نہ صرف عورت کی تنہائی اور محرومی کو اجاگر کیا ہے بلکہ اس معاشرتی نظام پر بھی سوال اٹھایا ہے جوعورت کے جذباتی وجود کونظر انداز کر دیتا ہے۔.اسی کیفیت کی عکاسی کرتے ہوئے عصمت چغتائی لکھتی ہیں:

"لحاف پھر امنڈنا شروع ہوا۔ میں نے بہتر چاہا کہ چپکی پڑی رہوں۔ مگر اس لحاف نے تو ایسی عجیب عجیب شکلیں بنانی شروع کیں کہ میں لرز گئی۔ معلوم ہوتا تھا غوں غوں کر کے کوئی بڑا سا مینڈک پھول رہا ہے اور اب اچھل کر میرے اوپر آیا۔"

(چوٹیں. "عصمت چغتائی 1982 کتابت: ایس ریاض (الہ آباد)، ص، 102)

یہی وہ مقام ہے جہاں کہانی کا نفسیاتی تناؤ اور تجسس اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ راویہ کی معصومیت اور اس کی محدود فہم اس منظر کو اور زیادہ پراسرار بنا دیتی ہے۔ دراصل یہی معصوم بیانیہ اس افسانے کی سب سے بڑی فنی خوبی ہے کیونکہ اس کے ذریعے ایک ایسی حقیقت کی جھلک دکھائی جاتی ہے جسے معاشرہ کھل کر بیان کرنے سے گریز کرتا ہے۔

عصمت چغتائی کے افسانوی سرمائے کا مطالعہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ ان کی تخلیقی بصیرت محض واقعات نگاری تک محدود نہیں بلکہ وہ انسانی نفسیات، معاشرتی جبر اور تہذیبی منافقت کے پیچیدہ پہلوؤں کو غیر معمولی جرت اور فنی مہارت کے ساتھ آشکار کرتی ہیں۔ ''گینڈا''، ''چوتھی کا جوڑا''، ''بچھو پھوپھی'' اور ''لحاف'' جیسے افسانے اس بات کے غماز ہیں کہ عصمت چغتائی نے معاشرے کے اُن گوشوں کو اپنی تخلیق کا محور بنایا جہاں عورت کی محرومیاں، جذباتی تنہائی اور معاشرتی تضادات پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔

ان افسانوں میں مصنفہ کی مشاہداتی باریکی، نفسیاتی بصیرت اور علامتی طرزِ اظہار نہایت نمایاں ہے۔ کہیں وہ نسوانی احساسات کی دبی ہوئی صداؤں کو لفظوں کا پیرہن عطا کرتی ہیں اور کہیں سماجی اقدار کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کے کردار محض افسانوی پیکر نہیں بلکہ اپنے عہد کی زندہ حقیقتیں ہیں، جو اپنے باطن میں ایک پوری تہذیبی اور سماجی کشمکش سموئے ہوئے ہیں۔

عصمت چغتائی کے دیگر افسانے بھی اسی فکری اور فنی روایت کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہیں، جن میں معاشرتی جبر، طبقاتی تفریق اور نسوانی وجود کے المیے کو نہایت

بے باکی اور حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان کے ہاں افسانوی بیانیہ محض تفریح یا داستان گوئی کا وسیلہ نہیں بلکہ ایک ایسا فکری اور سماجی مکالمہ بن جاتا ہے جو قاری کو اپنے معاشرے کی تلخ حقیقتوں سے روبرو کراتا ہے۔

زیرِ بحث افسانوں کے تجزیاتی مطالعے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ عصمت چغتائی نے اردو افسانے کو نہ صرف موضوعاتی وسعت عطا کی بلکہ اسے ایسی جرتِ اظہار اور فکری تازگی سے روشناس کرایا جس نے اردو ادب میں ایک نئی جہت پیدا کی۔ عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری اردو ادب میں ایک ایسے روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے جس میں انسانی جذبات، سماجی حقیقتوں اور تہذیبی تضادات کو نہایت جاندار اور اثر انگیز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہی خصوصیات ان کے افسانوں کو محض ادبی تخلیق نہیں بلکہ ایک فکری اور سماجی دستاویز کا درجہ عطا کرتی ہیں۔

:Bibliography

1۔ عصمت چغتائی سے ایک ملاقات انٹرویو از جلیل بازید پوری ماہنامہ شیرازہ، سری نگر جلد 30، شمارہ 10 / 8 ص 28 بحوالہ: جگدیش چندر ودھان، عصمت چغتائی: شخصیت اور فن، ص 201۔

2۔ عصمت چغتائی کے افسانے، جلد اول، لاہور، کتابی دنیا، 2006، ص، 13۔

3۔ عصمت چغتائی کے افسانے، جلد دوم، لاہور کتابی دنیا، 2013، ص، 321۔

4۔ دو ہاتھ "عصمت چغتائی، لاہور، یوسف ظفر, 1966، ص، 193۔

5۔ چوٹیں "عصمت چغتائی 1982 کتابت: ایس ریاض (الہ آباد)، ص، 102۔

☆☆☆

Asansol ke Under Graduate Tolaba ka Urdu Zaban ke tayin rawayya aur darpesh Masael ka Mutalea by Dr. Ameen Ansari (Asst. Prof. MANUU CTE, Asansol) cell-8125521025

ڈاکٹر امین انصاری (اسسٹنٹ پروفیسر، مانو کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، آسنسول)

آسنسول کے انڈر گریجویٹ طلبہ کا اردو زبان کے تئیں رویہ اور درپیش مسائل کا مطالعہ

تلخیص: مغربی بنگال کا شہر آسنسول صنعتی لحاظ سے مشہور و معروف شہر ہے جہاں اردو زبان بولنے اور پڑھنے والوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں کو مرکز میں رکھتے ہوئے انجام دی گئی اس تحقیق کا مقصد آسنسول خطے کے انڈر گریجویٹ طلبہ کا اردو زبان کے تئیں رویہ اور ان کو درپیش مسائل کا جائزہ لینا تھا۔ تحقیق کے لیے 112 طلبہ پر مشتمل نمونے کا انتخاب کیا گیا جس میں 44 طلبا اور 68 طالبات شامل تھیں۔ اعداد و شمار ایک سوالنامہ کے ذریعے جمع کیے گئے اور ان کا تجزیہ فیصد اور موضوعاتی طریقہ کار یعنی تھیم کی کوڈنگ کے ذریعے کیا گیا۔ نتائج سے یہ بات سامنے آئی کہ طلبہ کا اردو زبان کے تئیں رویہ مجموعی طور پر مثبت ہے۔ طلبہ کی اکثریت اردو کے مستقبل کے حوالے سے پرامید ہے اور اس میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ طلبہ نے اردو زبان کو درپیش متعدد مسائل کی نشاندہی بھی کی جن میں روزگار کے محدود مواقع، تعلیمی وسائل کی کمی، اساتذہ کی قلت اور نصابی مسائل شامل ہیں۔ تحقیق کے نتائج اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اگرچہ طلبہ کا رویہ مثبت ہے لیکن اردو زبان کے فروغ کے لیے عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں تعلیمی وسائل کی فراہمی، نصاب میں

اصلاحات اور روزگار کے مواقع میں اضافہ نہایت اہم ہیں۔

تعارف: اردو زبان برصغیر کی ایک اہم علمی و ادبی زبان ہے جو صدیوں سے سماجی، ثقافتی اور تعلیمی میدانوں میں نمایاں کردار ادا کرتی رہی ہے۔ جدید دور خصوصاً اعلیٰ تعلیم کے تناظر میں اردو زبان کی افادیت قابل بحث موضوع ہے۔ عالمی سطح پر انگریزی جیسی زبانوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ نے اردو کے تعلیمی اور پیشہ ورانہ امکانات کو بھی متاثر کیا ہے جس سے اس زبان کے مستقبل سے متعلق نئے سوالات جنم لے رہے ہیں۔ آسنسول خطہ جو کہ مغربی بنگال کا ایک اہم صنعتی مرکز ہے، مختلف لسانی اور ثقافتی پس منظر رکھنے والے طلبہ کا گہوارہ ہے۔ اس کثیر لسانی ماحول میں اردو زبان کے طلبہ کو ایک طرف جہاں دیگر زبانوں کے ساتھ مسابقت کا سامنا ہے وہیں دوسری طرف انہیں مختلف تعلیمی اور معاشی دشواریوں کا بھی سامنا ہے۔ اس خطے میں اردو زبان کا بول بالا ہے اور مختلف اردو میڈیم اسکولوں میں بچوں کی ایک بڑی تعداد زیر تعلیم ہے پھر بھی ان کی آبادی کے تناسب میں ہم دیکھتے ہیں کہ تعلیم سے متعلق ان کے تجربات، خیالات، رویے اور درپیش مسائل پر منظم تحقیقی کام کم انجام دیے گئے ہیں۔

چند تحقیقات جو سامنے آئی ہیں وہ اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ اردو زبان کی تدریس اور اس سے وابستہ طلبہ کو مختلف تعلیمی اور سماجی مسائل کا سامنا ہے۔ احمد (2024) کی آسنسول میں کی گئی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو میڈیم اداروں میں تعلیمی عدم مساوات، اساتذہ کی کمی، بنیادی سہولیات کا فقدان اور طلبہ کا کمزور معاشی پس منظر ان کی تعلیمی کارکردگی اور رویوں کو متاثر کرتا ہے۔ اسی طرح کشن گنج (بہار) میں کیے گئے ایک مطالعے (2023) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طلبہ میں اردو کے تئیں دلچسپی محدود ہے اور وہ اسے مستقبل کے روزگار کے حوالے سے کم مفید سمجھتے ہیں نتیجتاً وہ ہندی اور انگریزی کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ نتائج اردو زبان کی تدریس میں موجود خامیوں اور وسائل کی کمی کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے تناظر میں بھی اردو کے طلبہ کو متعدد

چیلنجز کا سامنا ہے۔ کوٹا چیرو و (2023) کے مطابق اردو میڈیم پس منظر رکھنے والے طلبہ انگریزی زبان میں مہارت کے فقدان کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہوتے ہیں جس کی بنیادی وجہ تعلیمی نظام میں توازن کی کمی ہے۔ دوسری جانب، خان اور دیگر (2024) کی تحقیق یہ ظاہر کرتی ہے کہ نوجوان اردو زبان کو سماجی وقار اور ترقی کے مواقع سے جوڑتے ہیں جب کہ اس کا استعمال زیادہ تر عملی کے بجائے علامتی حیثیت اختیار کر رہا ہے۔ ارشد اور دیگر (2025) نے بھی اردو زبان کو درپیش جدید چیلنجز جیسے نصابی فرسودگی، تدریسی کمزوریاں اور عالمی زبانوں کے بڑھتے اثر کو اجاگر کیا ہے جو طلبہ کے رویوں اور دلچسپی کو متاثر کرتے ہیں۔

ان تمام مطالعات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انڈر گریجویٹ سطح پر اردو کے طلبہ کے رویوں کو سمجھنے کے لیے ان کے تعلیمی اور سماجی مسائل کو مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ یہی طلبہ مستقبل میں اردو زبان کی بقا اور ترقی میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا زیرِ نظر تحقیق کا مقصد آسنسول خطے کے انڈر گریجویٹ طلبہ کے اردو زبان کے تئیں رویوں کا جائزہ لینا اور ان کو درپیش مسائل کی نشاندہی کرنا ہے تاکہ اردو زبان کی تعلیمی حیثیت کو بہتر بنانے اور مؤثر پالیسی سازی کے لیے رہنمائی فراہم کی جا سکے۔

مطالعہ کے مقاصد: زیرِ نظر تحقیق کے بنیادی مقاصد درج ذیل ہیں:

1- آسنسول خطے کے انڈر گریجویٹ طلبہ کا اردو زبان کے تئیں عمومی رویہ معلوم کرنا۔
2- انڈر گریجویٹ سطح پر اردو کے طلبہ کو درپیش تعلیمی مسائل کا تجزیہ کرنا۔
3- اردو زبان کے فروغ اور طلبہ کے مسائل کے حل کے لیے عملی تجاویز پیش کرنا۔

تحقیقی طریقہ کار: زیرِ نظر تحقیق ایک وضاحتی نوعیت کی تحقیق ہے جس کا مقصد آسنسول خطے کے انڈر گریجویٹ طلبہ کے اردو زبان کے تئیں رویوں اور ان کو درپیش مسائل کا جائزہ لینا ہے۔ اس تحقیق کی آبادی آسنسول خطے کے مختلف کالجوں میں زیرِ تعلیم انڈر گریجویٹ سطح کے طلبہ پر مشتمل ہے جو اردو زبان سے وابستہ ہیں یا جنھوں نے گریجویشن

کی سطح پر اردو مضمون کا انتخاب کیا ہے۔ تحقیق کے لیے 112 طلبہ کا انتخاب کیا گیا جو مختلف تعلیمی اداروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ نمونے کا انتخاب اتفاقی طور پر کیا گیا۔ اعداد و شمار جمع کرنے کے لیے ایک سوالنامہ تیار کیا گیا، جس میں لکرٹ اسکیل پر مبنی جملے و سوالات شامل تھے اس کے علاوہ کھلے سوالات بھی دیے گئے تا کہ طلبہ کے خیالات اور مسائل کو تفصیل سے سمجھا جا سکے۔ اس طرح یہ مطالعہ مقداری و معیاری دونوں قسم کے معطیات پر مبنی ہے۔ معطیات کی جمع آوری کے لیے آسنسول خطے کے مختلف اعلیٰ تعلیمی اداروں جیسے قاضی نذرل یونیورسٹی آسنسول، بی بی کالج آسنسول، بی سی کالج آسنسول، ٹی ڈی بی کالج رانی گنج، کلٹی کالج، کلٹی میں زیر تعلیم طلبہ کو اتفاقی طور نمونہ میں شامل کیا گیا۔ ان کے کمرہ جماعت میں متعلقہ ہیڈ سے اجازت لے کر سوالنامہ طلبہ میں تقسیم کیا گیا اور ان کے جوابات کو جمع کر کے ایکسل شیٹ میں مرتب کیا گیا۔

اعداد و شمار کا تجزیہ: حاصل شدہ اعداد و شمار کا تجزیہ فیصد کے ذریعے کیا گیا۔ رویوں کا تجزیہ کرنے کے لیے لکرٹ اسکیل کے جوابات کو درجہ بند کیا گیا، جبکہ کھلے سوالات کے جوابات کو موضوعاتی انداز میں تقسیم کر کے اہم مسائل کی نشاندہی کی گئی۔

مقصد 1: اردو زبان کے تئیں طلبہ کا رویہ **جدول نمبر 1:** اردو زبان کے تئیں طلبہ کے رویے کا مجموعی تجزیہ (n=112)

نمبر شمار	بیانات	متفق	غیر جانبدار	غیر متفق
1	اعلیٰ تعلیم میں اردو زبان کا مستقبل روشن ہے	95(84.9%)	11(9.8%)	6(5.4%)
2	میں اردو میں مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا/ چاہتی ہوں	103(92.0%)	6(5.4%)	3(2.7%)

3	اردو کو ادارہ جاتی سطح پر زیادہ حمایت ملنی چاہیے	101(90.2%)	8(7.1%)	3(2.7%)
4	اردو تعلیم کو ٹیکنالوجی کے ذریعے فروغ دینا چاہیے	105(93.8%)	6(5.4%)	1(0.9%)

تشریح:

مندرجہ بالا جدول سے واضح ہوتا ہے کہ آسنسول خطے کے انڈر گریجویٹ طلبہ کا اردو زبان کے تئیں رویہ مجموعی طور پر نہایت مثبت ہے۔ تمام بیانات کے سلسلے میں طلبہ کی اکثریت نے ''متفق'' کے اختیار کا انتخاب کیا ہے جو 85% سے 94% کے درمیان ہے۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے مستقبل کے بارے میں تقریباً 95% طلبہ پرامید ہیں، 90% سے زائد طلبہ اردو میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے خواہاں ہیں اور طلبہ کی بڑی تعداد اردو کے لیے ادارہ جاتی حمایت کی ضرورت کو محسوس کرتی ہے۔ تقریباً تمام طلبہ اردو تعلیم میں ٹیکنالوجی کے استعمال کے حامی ہیں۔ یہ نتائج اس بات کی واضح نشاندہی کرتے ہیں کہ طلبہ نہ صرف اردو زبان سے جذباتی اور تعلیمی وابستگی رکھتے ہیں بلکہ اس کے فروغ کے لیے جدید ذرائع اپنانے کے بھی خواہاں ہیں۔ اس تجزیے کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ آسنسول خطے کے انڈر گریجویٹ طلبہ کا اردو زبان کے تئیں رویہ واضح طور پر مثبت اور حوصلہ افزا ہے۔

مقصد 2: انڈر گریجویٹ طلبہ کو درپیش مسائل کا تجزیہ

جدول نمبر 2: اردو کے طلبہ کو درپیش اہم مسائل (موضوعاتی تجزیہ)

نمبر شمار	موضوع (Theme)	تعداد	فیصد (%)
1	روزگار کے محدود مواقع	46	41.1%
2	وسائل کی کمی (کتب، لائبریری، ڈیجیٹل سہولیات)	38	33.9%

3	اساتذہ کی کمی	29	25.9%
4	نصابی مسائل (قدیم/غیر مؤثر نصاب)	24	21.4%
5	سماجی سطح پر کم اہمیت/اردو کی حیثیت میں کمی	19	17.0%

تشریح:

مندرجہ بالا جدول سے واضح ہوتا ہے کہ اردو کے طلبہ کو متعدد تعلیمی، سماجی اور پیشہ ورانہ مسائل کا سامنا ہے۔ سب سے نمایاں مسئلہ روزگار کے محدود مواقع (41.1%) ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ طلبہ اردو زبان کو مستقبل کے کیریئر کے حوالے سے غیر یقینی تصور کرتے ہیں۔ اس کے بعد وسائل کی کمی (33.9%) ایک اہم مسئلہ کے طور پر سامنے آتی ہے جس میں کتب، لائبریری اور جدید ڈیجیٹل سہولیات کی عدم دستیابی شامل ہے۔ اسی طرح اساتذہ کی کمی (25.9%) اور نصابی مسائل (21.4%) بھی قابلِ توجہ ہیں جو تدریسی معیار پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ طلبہ نے اردو زبان کی سماجی سطح پر کم اہمیت (17.0%) کو بھی ایک مسئلہ کے طور پر بیان کیا جو زبان کے مجموعی مقام و مرتبہ سے متعلق ہے۔

اس تجزیے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اردو کے طلبہ کو سب سے زیادہ پیشہ ورانہ (روزگار) اور تعلیمی وسائل سے متعلق مسائل کا سامنا ہے جو ان کے تعلیمی رویے اور مستقبل کے انتخاب کو متاثر کر سکتے ہیں۔

مقصد 3: اردو زبان کے فروغ اور طلبہ کے مسائل کے حل کے لیے تجاویز

سفارشات: مندرجہ بالا تجزیے اور نتائج کی روشنی میں درج ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں:

1- روزگار کے مواقع: اردو زبان سے وابستہ طلبہ کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے سرکاری محکموں میں اردو مترجمین اور اساتذہ کی تقرری کو فروغ دیا جائے۔ اس کے علاوہ میڈیا، صحافت، پبلشنگ اور ڈیجیٹل وسائل کی تیاری میں اردو کے مواقع پیدا کیے جائیں۔ اردو کے طلبہ کو فری لانسنگ، ترجمہ اور آن

لائن تدریس جیسے جدید شعبوں سے روشناس کرایا جائے ساتھ ہی کیریئر کاؤنسلنگ کے مراکز قائم کیے جائیں تا کہ طلبہ کو عملی رہنمائی فراہم ہو۔ موجودہ تحقیق کے نتائج سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ 40 فیصد سے زائد طلبا روزگار کے بارے میں فکرمند ہیں۔

2- تعلیمی وسائل اور انفراسٹرکچر کی بہتری: اردو کے طلبہ کو معیاری تعلیمی وسائل فراہم کرنے کے لیے کالجوں میں جدید لائبریریاں اور اردو کی تازہ ترین کتب کی دستیابی کو یقینی بنانا چاہیے۔ موجودہ دور کے تناظر میں ڈیجیٹل وسائل جیسے الکٹرانک کتابیں، آن لائن رسائل و جرائد اور اردو سافٹ ویئر فراہم کرنا نہایت ضروری ہے۔ بدلتے دور کی ضرورتوں کے لحاظ سے اسمارٹ کمرہ جماعت اور آئی سی ٹی پر مبنی تعلیم کو فروغ دیا جانا چاہیے۔ اس تحقیق کے نتیجے بتاتے ہیں کہ 30 فیصد سے زائد طلبہ کو تعلیمی وسائل اور انفراسٹرکچر سے متعلق دشواری کا سامنا ہے۔

3- اساتذہ کی تقرری: تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے اساتذہ کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ موجودہ تحقیق میں 25 فیصد سے زیادہ طلبہ نے اساتذہ کی کمی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس دشواری کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو کے ماہر اور تربیت یافتہ اساتذہ کی مناسب تعداد میں تقرری کی جائے۔ اس کے علاوہ جدید تدریسی طریقوں کے ساتھ ٹیکنالوجی کے استعمال پر خصوصی توجہ دی جائے۔

4- نصاب میں جدت: اردو کے نصاب کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے نصاب میں ایسے موضوعات شامل کیے جائیں جو روزگار اور عملی زندگی سے متعلق ہوں۔ اردو ادب کے ساتھ ساتھ زبان کی عملی مہارتوں جیسے کہ لکھنا، ترجمہ کرنا اور ترسیل وغیرہ کو شامل کیا جائے۔ دیگر شعبہ جات یا فیلڈ سے جوڑتے ہوئے کورس متعارف کرائے جائیں، جیسے اردو اور میڈیا، اردو ترجمہ، اردو اور ترسیلی تکنیکیں، اردو تدریس کی مہارتیں وغیرہ۔ علاوہ ازیں نصاب کو وقتاً فوقتاً اپڈیٹ کیا جائے تا کہ یہ جدید تقاضوں کو پورا کرتا رہے۔ موجودہ تحقیق کے حوالے سے دیکھا جائے تو 20 فیصد سے زائد طلبہ نے اس

دشواری کا ذکر کیا۔

5- ٹیکنالوجی کا مؤثر استعمال: ٹیکنالوجی کا مؤثر استعمال وقت کی اہم ضرورت بن چکا ہے اور موجودہ تحقیق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ طلبہ اس کے استعمال کے حامی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے جدید ٹیکنالوجی کو بروئے کار لایا جائے۔ اس ضمن میں اردو کے لیے موبائل ایپس، آن لائن کورس اور ڈیجیٹل آموزشی پلیٹ فارمس تیار کیے جائیں یا انھیں متعارف کرایا جائے جیسے کہ MOOCs اور لرننگ مینجمنٹ سسٹم (LMS) وغیرہ۔ اسی کے ساتھ طلبہ کو اردو ٹائپنگ، ایڈیٹنگ اور ڈیجیٹل پبلشنگ کی باقاعدہ تربیت فراہم کی جائے تاکہ وہ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکیں۔

6- اردو زبان کی سماجی حیثیت کو مضبوط بنانا:

اردو زبان کی سماجی حیثیت کو مضبوط بنانا بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ وقت کے ساتھ اس کی اہمیت میں کمی واقع ہوتی محسوس ہو رہی ہے اور اس بات کی طرف طلبہ نے موجودہ تحقیق میں اشارہ بھی کیا ہے۔ اس کے لیے تعلیمی اداروں میں اردو ادبی پروگرامس، سیمینار اور ثقافتی تقریبات کا انعقاد کیا جانا چاہیے تاکہ طلبہ کے ساتھ عام لوگوں میں بھی اس زبان کے تئیں دلچسپی پیدا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو کو صرف ایک مذہبی یا خاص کمیونٹی کی زبان کے طور پر پیش کرنے کے بجائے اسے ایک علمی، ادبی اور عالمی زبان کے طور پر متعارف کرایا جائے۔ میڈیا اور سوشل میڈیا کے ذریعے اردو کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے اور مختلف زبانوں کے درمیان لسانی ہم آہنگی کو فروغ دیا جائے تاکہ اردو ایک وسیع تر سماجی تناظر میں اپنی جگہ مضبوط کر سکے۔

7- طلبہ کی حوصلہ افزائی اور تعلیمی معاونت:

طلبہ کی حوصلہ افزائی اور تعلیمی معاونت بھی اردو کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اس مقصد کے لیے اردو کے طلبہ کو وظیفے اور مالی امداد فراہم کی جائے تاکہ وہ بغیر کسی معاشی رکاوٹ کے اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ میرٹ کی بنیاد پر انعامات اور اعزازات دیے

جائیں تا کہ طلبہ کی کارکردگی میں بہتری آئے۔ کمزور طلبہ کے لیے الگ سے اضافی کلاسیں اور تعلیمی معاونت کا انتظام کیا جائے جبکہ طلبہ کی رہنمائی کے لیے پروگرامس بھی شروع کیے جائیں تا کہ وہ تعلیمی اور پیشہ ورانہ میدان میں بہتر رہنمائی حاصل کر سکیں۔

8- تحقیق اور علمی سرگرمیوں کا فروغ:

اردو زبان میں تحقیق اور علمی سرگرمیوں کا فروغ بھی بے حد اہم ہے۔ اس کے لیے طلبہ کو تحقیقی منصوبوں میں شامل کیا جائے تا کہ ان میں تحقیق کا ذوق پیدا ہو۔ کالج سطح پر ریسرچ سیمینارس اور ورکشاپس کا انعقاد کیا جائے تا کہ علمی تبادلہ کے خیال کو فروغ ملے۔ اردو جرائد و تحقیقی پلیٹ فارمس کو مضبوط بنایا جائے تا کہ معیاری تحقیق کو فروغ دیا جا سکے۔ ساتھ ہی جدید موضوعات جیسے ڈیجیٹل اردو، لسانیات اور ترجمہ نگاری پر تحقیق کی حوصلہ افزائی کی جائے تا کہ اردو زبان کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جا سکے۔

اہم نتائج اور بحث: اس تحقیق سے حاصل ہونے والے اہم نتائج درج ذیل ہیں:

1- آسنسول خطے کے انڈر گریجویٹ طلبہ کا اردو زبان کے تئیں رویہ مجموعی طور پر مثبت ہے۔

2- طلبہ کی اکثریت اردو زبان کے مستقبل کے حوالے سے پر امید ہے اور اس میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔

3- طلبہ اردو زبان کو ادارہ جاتی سطح پر مزید حمایت دیے جانے کے حق میں ہیں۔

4- اردو تعلیم میں ٹیکنالوجی کے استعمال کو طلبہ بڑی حد تک ضروری سمجھتے ہیں۔

5- اردو کے طلبہ کو سب سے زیادہ روزگار کے محدود مواقع کا مسئلہ درپیش ہے۔

6- تعلیمی وسائل کی کمی، اساتذہ کی قلت اور نصابی مسائل بھی نمایاں مسائل کے طور پر سامنے آئے ہیں۔

7- اردو زبان کی سماجی سطح پر کم ہوتی ہوئی اہمیت بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔

زیرِ نظر تحقیق کے نتائج واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ آسنسول خطے کے

انڈر گریجویٹ طلبہ کا اردو زبان کے تئیں مجموعی رویہ مثبت ہے۔ طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے اردو کے مستقبل کے حوالے سے بہتر امید کا اظہار کیا اور اس میں مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش بھی ظاہر کی۔ یہ نتائج اشارہ کرتے ہیں کہ اردو اس خطے کے طلبہ کے لیے اب بھی ایک اہم تعلیمی اور ثقافتی وسیلہ ہے۔ یہ مثبت رویہ سابقہ تحقیقات کے نتائج سے بھی ہم آہنگ ہے۔ خان وغیرہ (2024) نے رپورٹ کیا کہ انڈر گریجویٹ طلبہ اردو کو وقار، سماجی ترقی اور مستقبل کے مواقع سے مضبوطی کے ساتھ جوڑتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ علاقائی زبانوں کے مقابلے میں اردو کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی طرح کشن گنج (جس کا ذکر تعارف کے حصے میں کیا گیا ہے) میں کی گئی ایک تحقیق سے معلوم ہوا کہ ثانوی سطح کے طلبہ اردو میں معتدل سے مثبت دلچسپی رکھتے ہیں اور اسے ثقافتی لحاظ سے اہم سمجھتے ہیں اگرچہ وہ اس کی عملی افادیت کی محدودیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ موجودہ تحقیق ان مشاہدات کو مغربی بنگال کے انڈر گریجویٹ سطح تک وسعت دیتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی ہندوستان میں مسلم اکثریتی یا اردو پس منظر رکھنے والے طلبہ کے درمیان اردو کی ثقافتی اور ہم آہنگی پر مبنی قدر اب بھی مضبوط ہے۔

پھر بھی دیکھا جائے تو اس حوصلہ افزا رویے کے باوجود آسنسول کے طلبہ کو کئی اہم دشواریوں کا سامنا ہے جیسے کہ روزگار کے محدود مواقع ایک بڑے مسئلہ کے طور پر سامنے آیا جو اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلبہ کے مستقبل کے حوالے سے گہری تشویش کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمی وسائل کی کمی، اساتذہ کی قلت اور نصاب کی غیر مؤثریت کو بھی ایسے اہم عوامل کے طور پر پایا گیا جو اردو تعلیم کے معیار پر منفی اثر ڈالتے ہیں۔ یہ مسائل سابقہ مطالعات سے بھی مطابقت رکھتے ہیں۔ احمد (2024) (جنہوں نے خاص طور پر آسنسول کے اردو میڈیم اسکولوں کا جائزہ لیا) نے شدید بنیادی ڈھانچے اور سماجی و معاشی رکاوٹوں کی نشاندہی کی جن میں طلبہ و اساتذہ کے غیر مناسب تناسب، کمرہ جماعت میں حد سے زیادہ طلبہ کی تعداد اور طلبہ کے خاندانوں کی تشویش کن

معاشی حالت شامل ہیں۔ اسکولی سطح پر موجود یہ حالات انڈر گریجویٹ سطح کے تجربات کو بھی متاثر کرتے ہیں کیونکہ یہی طلبہ اسکولی تعلیم کے بعد گریجوئیشن کے لیے کالجوں کا رخ کرتے ہیں جس کے نتیجے میں وسائل اور اساتذہ کی کمی جیسے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کی نشاندہی موجودہ تحقیق میں کی گئی ہے۔

اسی طرح کوٹا چروو (2023) نے دستاویزی شواہد پیش کیے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU) کے اردو میڈیم انڈر گریجویٹ طلبہ کو نصاب میں اردو ادب پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جبکہ دیگر مہارتوں کی ترقی کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی اہل اساتذہ کی کمی بھی پائی جاتی ہے۔ موجودہ تحقیق میں نصاب کی غیر مؤثریت اور وسائل کی قلت سے متعلق نتائج اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اردو میڈیم تعلیم کی نظامی سطح پر نظر اندازی اعلیٰ تعلیم کے مرحلے پر بھی مسلسل رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح ارشد اور دیگر (2025) نے اردو کو درپیش اکیسویں صدی کے وسیع تر چیلنجز کی نشاندہی کی جیسے قواعد کی کمزوری، ابتدائی تعلیم میں نستعلیق رسم الخط کو نظر انداز کرنا اور عالمگیریت اور غالب زبانوں کے اثرات جو اردو کی عملی افادیت کو کم کرتے ہیں۔ موجودہ تحقیق میں روزگار کے محدود مواقع سے متعلق تشویش اسی خلا کی عکاسی کرتی ہے جو ثقافتی وابستگی اور عملی اہمیت کے درمیان پایا جاتا ہے جیسا کہ کشن گنج کی تحقیق میں بھی سامنے آیا جہاں طلبہ نے اردو کو ملازمت کے لیے کم ہی مفید قرار دیا اور کیریئر کے امکانات کے لیے ہندی یا انگریزی کو ترجیح دی۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو طلبہ کا اردو کے تئیں رویہ حوصلہ افزا اور ثقافتی بنیادوں پر قائم ہے پھر بھی موجودہ بنیادی، تدریسی اور سماجی و معاشی مسائل اس کی پائیدار ترقی اور طلبہ کی خواہشات کی تکمیل میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ سابقہ تحقیقات کے تناظر میں موجودہ نتائج ایک مستقل رجحان کو واضح کرتے ہیں کہ اردو کے تئیں مثبت ہم آہنگی پر مبنی رویے ساختی رکاوٹوں کے ساتھ ساتھ موجود ہیں جو اس کے عملی فوائد کو محدود کرتے

ہیں۔لہٰذا ضروری ہے کہ ان مسائل کو سنجیدگی سے حل کیا جائے جس کے لیے پالیسی سطح پر مداخلت، اساتذہ کی بہتر تربیت، نصاب کی جدید کاری اور روزگار کے مواقع سے بہتر ربط قائم کرنا شامل ہے۔ اس طرح کے اقدامات نہ صرف آسنسول جیسے علاقوں میں اردو زبان کی تعلیمی اور سماجی حیثیت کو مضبوط کریں گے بلکہ طلبہ کی ثقافتی وابستگی اور ان کے مستقبل کے مواقع کے درمیان موجود خلا کو بھی کم کریں گے جیسا کہ قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے جامع تعلیم کے اہداف میں بھی زور دیا گیا ہے۔

اختتامیہ:

زیرِ نظر تحقیق کے نتائج اس امر کی واضح عکاسی کرتے ہیں کہ آسنسول خطے کے انڈر گریجویٹ طلبہ کا اردو زبان کے تئیں رویہ مجموعی طور پر مثبت اور امید افزا ہے۔ طلبہ نہ صرف اردو زبان کی تعلیمی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ اس میں مزید تعلیم حاصل کرنے اور اس کے فروغ کے لیے بھی آمادہ نظر آتے ہیں۔ یہ رجحان اس بات کی دلیل ہے کہ اردو زبان آج بھی نوجوان نسل کے درمیان اپنی معنویت اور کشش برقرار رکھے ہوئے ہے۔ حالانکہ اس مثبت رویے کے باوجود تحقیق سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ طلبہ کو متعدد ایسے مسائل کا سامنا ہے جو ان کے تعلیمی سفر اور مستقبل کے امکانات کو متاثر کرتے ہیں۔ خصوصاً روزگار کے محدود مواقع ایک سنگین مسئلہ کے طور پر سامنے آیا ہے جو طلبہ میں غیر یقینی صورت حال اور تشویش کو جنم دیتا ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمی وسائل کی کمی، معیاری اساتذہ کی قلت اور نصاب کی فرسودگی جیسے مسائل بھی اردو تعلیم کے معیار کو متاثر کر رہے ہیں۔

لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے محض طلبہ کے مثبت رویے کافی نہیں ہیں بلکہ اس کے لیے عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ تعلیمی اداروں، پالیسی سازوں کے ساتھ سماجی سطح پر اردو زبان کو درپیش مسائل کے حل کے لیے سنجیدہ اور مربوط کوششیں کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر روزگار کے مواقع میں اضافہ، تعلیمی وسائل کی

بہتری، اساتذہ کی تقرری اور نصاب میں اصلاحات جیسے اقدامات کیے جائیں تو اردو زبان اپنی موجودہ حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے روشن مستقبل کے دروازے کھول سکتی ہے۔

حوالہ جات:

Ahmad, B. (2024). Students belonging to Urdu medium schools from Asansol city: A study of equitable education and their circumstances of birth and background. International Journal of Multidisciplinary Research and Growth Evaluation, 6(12), Part B.

Ansari, M. T. A. (Ed.). (2023). A study on the status of Urdu language and students' perception of Urdu language as a subject in Kishanganj District of Bihar, India. Asian Journal of Language, Literature and Culture Studies, 6(3), 336-346.

Arshad, W., Murtaza, H. G., Arshad, S., & Sanaullah, S. (2025). Challenges and prospects of Urdu language and literature in the 21st century: A cultural and linguistic perspective. Journal of Applied Linguistics and TESOL, 8(2), 1261-1272.

Creswell, J. W. (2014). Research design: Qualitative, quantitative, and mixed methods

approaches (4th ed.). SAGE Publications.

Garrett, H. E. (2008). Statistics in psychology and education (6th ed.). Surjeet Publications.

Khan, Z., Shahabullah, & Khalid. (2024). Perception of prestige: The study of undergraduate students' attitude towards Urdu and Hindko. Journal of Arts and Linguistics Studies, 2(4), 2409-2430.

Kottacheruvu, N. (2023). Analyzing the challenges and hurdles faced by Urdu medium students in achieving proficiency in essential English grammar: An assessment. Journal for Educators, Teachers and Trainers, 14(5), 439-443.

National Council of Educational Research and Training (NCERT). (2006). Position paper on teaching of Indian languages. NCERT.

Rahman, T. (2002). Language, ideology and power: Language-learning among the Muslims of Pakistan and North India. Oxford University Press.

☆☆☆

Kashmir mein Farsi Sher-o-Adab aur Khamsa Navisi ka ek Mukhtasar Jaeza by Mubeen Ahmad aur Dr. MD. Rizwan (dept. of Persian & Central Asian Studies MANUU, Hyderabad)cell-9844963518

مبُین احمد اور ڈاکٹر محمد رضوان (شعبۂ فارسی ومطالعات وسط ایشیا، مانو، حیدرآباد)

کشمیر میں فارسی شعروادب اور خمسہ نویسی کا ایک مختصر جائزہ

کشمیر کے فارسی شعروادب اور خمسہ نویسی کو زیر قلم لانے سے پہلے کشمیر کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ کشمیر ہندوستان کے صوبوں میں سے ایک ہے۔ ہندوستانی کشمیر کو ایک چھوٹا سا ایران کہتے ہیں۔ یہ زمین ہندوستان کے شمال میں اونچے پہاڑوں کے بیچ واقع ہے۔ ہندوستان کے جغرافیائی نقشے کو مدنظر رکھتے ہوئے مذکورہ خط کو ''انڈین آفیسر'' کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اسکے چاروں طرف بلند وبالا پہاڑ اس طرح گھیرے ہوئے ہیں کہ یہ سرزمین ایک بڑی وادی کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ اسے وادی کشمیری یا وادی کشمیر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ سرینگر ریاست جموں وکشمیر کا دارالحکومت ہے۔ یہ ہندوستان کی واحد ریاست ہے جس کے دو دارالحکومت ہیں۔ ایک گرمیوں میں سرینگر اور دوسرا سردیوں میں جموں۔ سرینگر شہر کشمیر کے وسط میں واقع ہے۔ کشمیر کا یہ مرکزی شہر سرینگر دو پہاڑوں کے بیچ میں واقع ہے۔ اور اس میں خوبصورت پارکیں اور باغات ہیں۔ شہر کے وسط میں ایک خوبصورت جھیل ہے جسکا صاف وشفاف پانی دو پہاڑوں کے بیچ گردش کرتا ہے اسے دل کہتے ہیں۔ اور یہ صحیح معنوں میں سوگواروں کے دلوں

اورزندگیوں کو اغوا کرنے والا ،اور انسانوں اور اُن کی زندگیوں کو دھوکہ دینے والا ہے۔ اس جھیل کے قریب ایک مشہور پہاڑ ہے۔ کشمیری مسلمان اسے ''کوہ سلیمان'' کہتے ہیں۔اور ہندو اسے ''شنکر اچاریہ بادمی'' کہتے ہیں۔ کیونکہ اس پہاڑ کی چوٹی سے جھیل کا کیا ہی حسین وجمیل نظارہ ہوتا ہے۔ان بلند وبالا پہاڑوں کی تصویر جنہیں سفید بادلوں نے پیشانی پر بوسہ دیا ہوا ہے۔اس جھیل کے پرسکون اور صاف پانی میں مکمل طور پر نظر آتا ہے۔لرزتے درخت،اونچے صنوبر،وسیع میدانی علاقہ اور برف سے ڈھکی چوٹیاں جو ہر دیکھنے والے کی آنکھوں کے سامنے کا منظر پیش کرتی ہیں جس کی مثال دنیا میں بہت کم جگہوں پر دیکھی جاسکتی ہے۔

کشمیر کی آب وہوا معتدل اور نہایت خوشگوار ہے۔موسم سرما میں بہت سردی ہوتی ہے۔سردیوں میں برف پڑتی ہے۔اونچی چوٹیاں سال کے تقریباً آٹھ مہینے برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ بہت سے چشمے، دریااور ندی نالے، کشمیر کی سرزمین کو سرسبز و شاداب رکھتے ہیں کشمیر کے لوگ فارغ الوقت میں اس قدرتی خوبصورتی سے لطف اٹھاتے ہیں۔ یہاں تک کے ہندوسان اور ہندوستان سے باہر کے لوگ بھی کشمیر میں سیر و سیاحت کے لیے آکر اس قدرتی نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔الغرض کشمیر کی فارسی خمسہ نویسی کو ہی ملحُوظِ نظر رکھنا لازمی ہے لیکن اس کے ساتھ مختصر طور پر کشمیر میں شہمیری دور سے لے کر سکھ دور تک کے فارسی شعروادب کو زیرِقلم لانا بھی ضروری ہے۔

کشمیر میں فارسی زبان وادب کا چلن چودھویں صدی عیسوی میں باضابطہ طور پر ہوا۔ اگرچہ اس کے اثرات بہت پہلے ہی پڑ چکے تھے۔اور کشمیر میں فارسی کا رواج ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۴۱ء تک یہاں اپنی آب وتاب کے ساتھ قائم رہا۔اس کے علاوہ اگر ہم اسلام کی بات کریں تو کشمیر میں اسلام کا پرتو چودھویں صدی عیسوی میں پڑا۔ اسکی نشرواشاعت کرنے والے بیشتر مبلغین کا تعلق ایران اور وسط ایشیا سے تھا۔ان کی مادری زبان فارسی تھی۔لہذا اسلام کی تبلیغ میں انہوں نے جس زبان کا سہارہ لیا وہ یہی فارسی

زبان تھی۔لیکن اس زبان نے اپنا اثر ونفوذ کشمیر میں بہت پہلے قائم کیا تھا جس کے چند وجوہات قرار دیے جاسکتے ہیں۔اول یہ کہ ماضی میں کشمیر کو ایران اور وسط ایشیا کے ساتھ آپس میں گہرے روابط تھے جس کا مشاہدہ یہاں کی اکثر کتب تواریخ سے ہوتا ہے۔چنانچہ انہیں آپسی مراسم اور تعلقات کے نتیجے میں آخری ہندو حکمرانوں تک بہت سارے فارسی الفاظ سنسکرت زبان میں رواج پا چکے تھے۔دوم یہ کہ بعض بیرونی حملہ آوروں نے خصوصاً وسط ایشاء سے تعلق رکھنے والوں کے حملوں کی پاداش میں بعض لوگ یہیں آباد ہوئے جن میں اکثر مسلمان تھے۔چنانچہ ان کے لئے بعد میں ایک خاص اصطلاح ''ترکش'' (مسلمان) کے نام سے رائج تھی۔

کشمیر کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آخری ہندو راجاؤں کے دور میں بعض لوگ اسلام کے نور سے منور ہو چکے تھے۔تاریخ میں درج ہے کہ ''درآں زماں آبائی کشمیر اندک جماعت مشرف بہ اسلام بودند۔چنانچہ اس تعداد میں وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا گیا جو اکثر مبلین،صوفیائے عظام کی مساعی اور کاوشوں کا ہی ثمر قرار دیا ہے۔ایسے بزرگوں میں سید شرف الدین بلبل شاہ،میر سید علی ہمدانیؒ اور انکے فرزند میر سید محمد ہمدانیؒ کے نام قابل ذکر ہیں۔چنانچہ ۷۲۶ھ مطابق ۱۳۲۰ء میں رینچن شاہ نے حضرت شرف الدین بلبل کے دست حق پر بیعت کی اور اسکا اسلامی نام صدرالدین پڑ گیا۔یہ کشمیر کے اولین بادشاہ تھے جنھوں نے باضابطہ طور پر اسلام قبول کیا۔اسکے ساتھ ہی یہاں لسانی،تہذیبی اور ثقافتی تبدیلیاں بھی روشناس ہوئیں جس کی اپنی کچھ وجوہات تھیں ان امورات کی نشاندہی ذیل میں کی جاسکتی ہے۔

اول یہ کہ کشمیر میں اسلام ایران اور وسط ایشیاء سے آئے ہوئے مبلغین کے ذریعے سے پھیلا جنکی زبان فارسی تھی۔کشمیری مادری زبان ہونے کے باوجود علمی وادبی حلقوں میں اپنا اثر ونفوذ نہیں رکھتی تھی۔دوم یہ کہ یہاں کی علمی وادبی زبان سنسکرت تھی۔کشمیری زبان میں اگرچہ کہاوتوں،لوک کہانیوں اور محاوروں کی کوئی کمی نہیں تھی۔مگر اس

زبان کا اپنا کوئی رسم الخط نہ تھا۔ یہاں تک کہ شاردہ رسم الخط میں بہت کچھ لکھا گیا تھا۔ کشمیری زبان میں خط نستعلیق رائج ہونے سے اس زبان کی جہاں ایک کمی پوری ہوئی وہیں فارسی کے کچھ الفاظ کشمیری زبان میں وارد ہوئے۔ سوم یہ کہ کشمیر اور ایران کے مابین ابتداء سے ہی تجارتی، تہذیبی اور ثقافتی رشتے قائم تھے۔ یہاں پر جب ایرانی مبالغوں اور صوفیوں کے ذریعے سے دِین اسلام کی نشر واشاعت ہوئی تو یہاں کے لوگوں نے انہیں رشتوں کے زیر اثر آ کر ایران سے وارد ہوئی زبان کو بھی اپنانا شروع کیا۔ چہارم یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ایران اور وسط ایشیاء سے لوگ کئی بار کشمیر کی سرزمین کو فتح کرنے کے لیے حملہ آور کی حیثیت سے آئے اور ساتھ ہی بعض بزرگان دین اور صوفیائے کرام اور ان کے رفقاء وغیرہ اسلام کا آفاقی پیغام پہنچانے کی خاطر یہاں وارد ہوئے۔

یہ بات عیاں ہے کہ کشمیر میں فارسی زبان ایران اور وسط ایشاء سے آئے ہوئے مبلغین اور صوفیائے کرام کی مرہون منت ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ فارسی زبان یہاں بہت پہلے سے اثر انداز رہی۔ کیونکہ کسی قوم یا ملک کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ راتوں رات کسی غیر ملکی زبان کو اتنی آسانی سے قبول کر لے۔ فارسی زبان جو دین اسلام کی نشر و اشاعت میں کافی مدد ومعاون ثابت ہوئی ہے۔ اس کے لئے ماحول پہلے ہی سازگار ہو چکا تھا۔ اسطرح سے اسلامی تہذیب وثقافت اور تمدن جسکی داغ بیل بلبل شاہ کے کشمیر وارد ہونے کے ساتھ ہی پڑی اور پھر مجموعی طور پر اسلام کی وسیع تر تبلیغ کے سلسلے میں اسلامی علوم وفنون اور عقائد کو فروغ حاصل ہوا۔ لہذا اسلام کو رواج دینے میں فارسی زبان نے مرکزی کردار ادا کیا۔

شہمیری دور ۷۴۳ھ مطابق ۱۳۳۹ سے شروع ہوا اور ۹۶۲ھ مطابق ۱۵۵۴ء پر ختم ہوتا ہے۔ یہ دور تقریباً سوا دو سو سال کے طویل عرصہ پر حاوی ہے۔ شہمیری سلاطین کے پرسر اقتدار آنے پر ایرانی علماء وفضلا پر تو نوازشات کی بارشیں ہونے لگیں اور اس زبان کو

پہلی بار سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا اور پھر یہ زبان دربار سے نکل کر عوامی سطح تک وسعت پا گئی اور اس دور کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ایرانی تمدن وثقافت کے علاوہ فارسی زبان نے وہ انمٹ نقوش ثبت کئے جس پر بعد میں مجموعی حیثیت سے ایک ایسی عالیشان عمارت برپا کی گئی کہ اس کے شکست در و دیوار سے صنادید عجم کے آثار آج کل بھی باضابطہ طور پر ہویدا ہیں۔ شہمیری دور میں فارسی زبان وادب کی مجموعی افادیت کے پیش نظر ایک تدریجی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ سلطان شمس الدین شہمیر سے لیکر سلطان شہاب الدین کے برسر اقتدار آنے تک فارسی ادب میں ہوئی پیش رفت کا کوئی بھی سراغ کسی بھی فارسی تصنیف یا تالیف سے نہیں مل سکا۔ سلطان شہاب الدین کے دورہ اقتدار میں ہی فارسی زبان نے اصل میں سنسکرت کی جگہ لینی شروع کی۔ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ آٹھویں صدی ہجری کی نصف صدی میں اسلامی عقائد اور فارسی زبان وتمدن کی بنیادیں مضبوط کرنے کی غرض سے پہلی بار کشمیر تشریف لائے۔ انھوں نے عارف سید حسین سمنانیؒ کو سعادت کی ایک جماعت کے ہمراہ کشمیر بھیج دیا جنکی زبان فارسی تھی۔ جنہوں نے کشمیر کے مختلف دیہات میں دِین اسلام کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وادب کو عام کرنے کی سعی وکوشش کیں۔ جس کے نتیجے میں یہاں کے لوگوں نے فارسی زبان وادب میں مہارت حاصل کی۔ چنانچہ ملا احمد نے اسلامی فقہ پر ''فتویٰ شہابی'' اور شہاب الدین عبدالحکیم نے ''شفا المرض'' نام کی کتابیں فارسی زبان میں لکھیں۔ سلطان قطب الدین خود بھی شاعر تھے اور شاعروں اور عالموں کا قدردان بھی تھا۔ اس نے اپنے بسائے ہوئے شہر قطب الدین پورہ میں ایک یونیورسٹی قائم کی تھی۔ جس کے سربراہ پیر حاجی محمد قاری مقرر ہوئے۔ جہاں پر قرآن وحدیث، فقہ، علم کلام، علم منطق وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ شیخ سلیمان کشمیری، جو کہ ابتداء میں ایک ہندو برہمن تھا کو اسی دانش گاہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ''امام القرآن'' کا لقب دیا گیا تھا۔ حضرت امیر کبیر قطب الدین کے دور میں دوسری بار کشمیر تشریف لائے اور ان کے ساتھ تقریباً سات سو

سادات علماء مشائخ تھے۔جنکی ساعی کی بدولت فارسی زبان نے کافی ترویج پائی بادشاہ خود بھی شاعر تھا۔اور شاعری میں قطب تخلص رکھتا تھا چنانچہ ان سے منسوب بعض اشعار بہت سی کتب تواریخ میں درج ہیں۔اس سلسلے کو قائم ودائم رکھتے ہوئے حضرت سید محمد ہمدانیؒ سلطان سکندر کے عہد میں تین سو عالموں کے ہمراہ کشمیر آئے۔سلطان سکندر اگر چہ خود شاعر یا ادیب نہ تھے۔لیکن آپ کا دربار شاعروں ادیبوں، عالموں اور فاضلوں کی آماجگاہ تھا۔موصوف نے سلطان سکندر کے نام پر ''رسالہ سکندریہ'' لکھا۔شاہی خان المعروف بہ سلطان زین العابدین بڈشاہ کشمیر کے تخت پر ۱۴۲۰ء متمکن ہوئے۔وہ ایک عقل مند رعایا پرور اور علم دوست بادشاہ تھا۔چنانچہ ان کے بغیر کشمیر کی علمی وادبی تاریخ نامکمل تصور کی جاتی ہے۔بادشاہ خود شاعر تھا اور ایک اچھا نثر نگار بھی۔چنانچہ انھوں نے نثر میں ''پریشان'' اور ''آتش بازی'' نام کی باضابطہ تصانیف لکھیں۔

انھوں نے ہی پہلی بار سنسکرت کے بجائے فارسی زبان کو یہاں کی سرکاریز زبان قرار دیا۔ایران، خراسان، سمرقند، بخارا جیسے تہذیب وثقافت اور تمدن سے مالا مال ملکوں سے اپنے رشتے مستحکم کئے۔نوشہرہ سرینگر میں ایک یونیورسٹی قائم کی اور ایک دارالترجمہ کا قیام بھی عمل میں لایا، جس میں بہت ساری مشہور کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔(۱) چنانچہ ملا احمد کشمیری نے کلہن کی ''راج ترنگنی'' کا ترجمہ فارسی میں ''وقائع کشمیر'' کے نام سے کیا اور کشمیر میں فارسی تاریخ نویسی کا بابائے آدم کہلایا۔(۲) ملا احمد علامہ نے ''مہابھارت'' اور ''کتھا سرت ساگر'' کا بحرالاثمار'' کے نام سے ترجمہ بھی کیا۔

زین العابدین نے اپنے دور اقتدار میں پہلی بار غیر مسلموں کو فارسی پڑھنے کی ترغیب دی اور انہیں وظائف سے بھی نوازا۔جس کے نتیجہ میں بہت سارے غیر مسلم عالم وفاضل وجود میں آئے۔جن میں جون راج جس نے سنسکرت میں ہی راج ترنگنی کا دوسرا اور تیسرا حصہ مکمل کیا۔ چنانچہ ویدوں اور شاستروں کو ہندوستان سے منگوا کر انہیں فارسی میں ترجمہ کرایا۔بودھی بٹ کو سنسکرت اور فارسی دونوں زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔اُنہیں

شاہنامہ زبانی یاد تھا۔ اور وہ شہنشاہ کو روزانہ اسکے اشعار سُنایا کرتا تھا۔ زین العابدین نے دارالترجمہ کے قیام اور مختلف زبانوں کے شاہکاروں کو ایک دوسرے کے سانچوں میں ڈھال کر ایک دوسرے کی مذہبی ہم آہنگی اور علوم کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ زین العابدین کی نوازشات کے نتیجے میں اور اس کے بعد دیگر شہمیری حکمرانوں کے دور اقتدار میں جو شعراء پیدا ہوئے اُن میں قاضی ابراہیم، بابا اویسی، قاضی حمید الدین مورخ، ملا ضیائی، ملا نادری، ملا پارسا، حاجی بابا ادھمؔ، ملا حافظ بصیر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اسطرح سے شہمیری دور میں اتنا چلن ہوا کہ پورا کشمیر ''ایران صغیر'' کے نام سے موسوم کیا جانے لگا اور روایتی اصناف سخن کے علاوہ غزل، رباعی، مثنوی، داستان سرائی، تاریخ اور تذکرے وغیرہ بھی لکھے گئے۔

چک دور: سرزمین کشمیر میں شہمیری سلاطین کی دوسو سال سے زائد عرصہ کی حکمرانی کا خاتمہ ہوجانے کے بعد یہاں کا ایک اور مقتدر خاندان ''چک خاندان'' کے نام سے برسر اقتدار آیا۔ چک خاندان کشمیر کا دوسرا حکمران خاندان ہے جس کی سلطنت کی باضابطہ بنیاد غازی خان چک کے ہاتھوں ۹۶۲ھ میں پڑی۔ اس خاندان نے ۳۲ سال تک کشمیر پر حکومت کی اور اس عرصہ میں اس خاندان میں آٹھ بادشاہ ہوئے جنہوں نے یکے بادیگرے ۹۶۲ سے لے کر ۹۹۴ھ تک کشمیر پر حکومت کی۔ چک دور فارسی زبان اور ادب کی ترقی وترویج کے لحاظ سے بہت بڑی پہچان رکھتا ہے۔ ''پروفیسر عبدالقادر سروری اسکی وجہ بیان کرتے ہیں اور لکھتے ہیں'' چک سلاطین کے عہد میں فارسی علم وادب اور شاعری کو پھر سے نئی تحریک نصیب ہوئی اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ چک سلاطین شعیہ مسلک پر چلتے تھے۔ اسلیے اس زمانے میں ایران سے کئی شعیہ وعلما کشمیر آئے۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ چک حکمرانوں میں بعض علم وادب کے قدردان تھے۔ اور سرپرست تھے۔ حسین شاہ اور یوسف شاہ خود شاعر تھے۔ غازی خان چک ایک عظیم اور قوی حکمران ہونے کے علاوہ ایک شاعر بھی تھا اس کے دربار میں شعراء کا ایک بہت بڑا اجتماع رہتا

تھا۔اس کے بعدان کا بھائی حسین شاہ چک (۹۷۱-۹۷۸ھ) تخت نشین ہوا۔حسین شاہ چک نے اپنے عہد حکومت کے دوران علم وادب کو بڑھاوا دینے کے سلسلے میں ایک مدرسہ کی بھی بنیاد ڈالی تھی۔حسین شاہ خود ایک بہت بڑا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ شعراء کا بڑا قدردان تھا اور اہل علم کی سرپرستی کرتا تھا۔انھیں انعام واکرام سے نوازتا تھا اسکا دربار بڑے بڑے شاعروں کا آماجگاہ تھا۔اسکی قدردانی اور سرپرستی کا شہرہ سن کر علما وشعراء ایران اور ہندوستان سے کشمیر چلے آئے اور اسکے دربار سے منسلک ہوئے اس کے دربار سے جو شعرا وابستہ تھے۔ان میں سے ملا نامی اول، ملا نامی ثانی، بابا طالب اصفہانی اور میر علی حیرفی کے نام قابل ذکر ہیں۔حسین شاہ چک کے بعد سلطان علی شاہ چک (۹۷۸-۹۸۷ھ) تخت نشین ہوا۔ملا مہدی اس دور کا شاعر تھا اسے دربار شاہی میں بڑا قرب حاصل تھا۔اوراس دربار کا ملک الشعراء بھی تھا۔علی شاہ چک کی وفات کے بعد اس کا بیٹا یوسف شاہ چک (۹۷۹-۹۹۳ھ) تخت نشین ہوا۔یوسف شاہ چک ایک اچھا شاعر بھی تھا۔اسے فارسی شعروادب سے بڑا لگاو تھا۔اس وجہ سے اسکا عہد فارسی ادب کی ترقی کے لیے باوجود مختصر ہونیکے بھی ایک ممتاز دور رہا ہے۔چنانچہ یوسف شاہ چک اور یعقوب شاہ چک کے عہد کے چند شعراء اسطرح سے ہیں مولانا احمد، ملا عینی، ملا احسن اسود، علی ملک چک، محمد ملک چاڈوروی، میر نوروز، مولانا محمد امین مستغنی کشمیری، مرزا علی خان خواجہ میرم بزاز سکندر پوری، خواجہ ضیاء الدین محمد بلخی، نجمی کشمیری، لذتی، ملا مہدی علی کشمیری کا تعلق بھی چک دور کے شعراء میں سے تھا۔اسکے علاوہ چکوں کے دور سلطنت میں اس وقت کے بعض صوفی بزرگ جن کا علم وادب میں ایک الگ مقام تھا۔ان میں حضرت مخدوم شیخ حمزہؒ، بابا داود خاکیؒ، بابا علی رینہ، بابا حیدر تولہ مولیٰؒ، شیخ احمد چگلی، خواجہ حسن قاری، خواجہ اسحاق قاری وغیرہ شامل ہیں۔مورخ سید علی نے ''تاریخ کشمیر'' اسی دور میں لکھی۔چکوں نے بھی شہمیریوں کی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے فارسی زبان وادب کی تشہیر میں کافی کام کیا۔اسکے بعد اگر ہم چک دور میں خمسہ

نویسی کی بات کریں تو اس دور کے ایک بہت بڑے صوفی شاعر شیخ یعقوب صرفی جس کا شمار نہ صرف اس دور کے صوفیائے کرام میں ہوتا ہے بلکہ چوٹی کے عالموں اور شاعروں میں بھی گنے جاتے ہیں اس کے علاوہ وہ مغل دور کے شاعروں میں بھی شمار ہوتے ہیں۔ کشمیر میں خمسہ نویسی کی بنیاد رکھنے والا پہلا بڑا مشہور و معروف شاعر ہے جس نے دسویں صدی ہجری میں نظامی گنجوی کی تقلید میں خمسہ یا پنج گنج لکھ کر کشمیر میں اس روایت کو قائم کیا۔ اس کے علاوہ بدری کشمیری نے بھی اسی چک دور میں نظامی گنجوی کی تقلید میں خمسہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔

مغل دور: مغل دور کشمیر میں ۹۹۴ھ بمطابق ۱۵۸۶ء سے شروع ہوا اور ۱۱۶۶ھ بمطابق ۱۷۵۲ء پر اختتام پزیر ہوا۔ کشمیر پر مغلوں کے تسلط کے بعد فارسی علم و ادب اور شاعری کی ترقی کے لئے نئی راہیں ہموار ہوئی۔ اسکے ساتھ ساتھ وہ سارا تہذیبی سرمایہ جو مغلوں کی حکومت ہند کے عروج کے دور میں نشونما پایا اس کا حقدار کشمیر بھی بنتا گیا۔ ۱۵۸۶ء سے لیکر ۱۷۵۲ء تک کوئی ڈیڑھ سو ناظم کشمیر پر دہلی کی طرف سے حکمرانی کرتے رہے۔ پہلا ناظم قاسم خان میر بحر مقرر ہوا تھا۔ اکبر سے لیکر مغل حکمران احمد شاہ کے زمانے تک کشمیر کی سیاسی زندگی کو بڑے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ تاہم جہاں تک فارسی زبان و ادب کا تعلق ہے۔ یہ زمانہ اس کی ترقی کے لیے کافی مساعد ثابت ہوا۔ مغل حکمرانوں اور امراء کو فارسی سے جو لگاو اور شعر و سخن کا جو ذوق تھا اسکا اثر کشمیر میں بھی نمایاں تھا۔ کشمیر کے فارسی شعراء کی سرپرستی ہوئی اور اسکے علاوہ ایران سے کئی شعراء جو پہلے ہندوستان آئے اور بعد میں کشمیر میں وارد ہوئے۔ اکبر خود ۹۹۶ھ بمطابق ۱۵۸۹ء میں کشمیر آیا تھا۔ کشمیر میں اکبر کے ساتھ آئے ہوئے دربار سے بہت سے علما اور شعراء منسلک تھے ان میں امیر فتح اللہ شیرازی، ملا محمد علی کشمیری، شیخ احمد زاہد، ابوالفتح نجمی، مظہری، نورالدین عشائی، عبدالغنی خاں قزوینی، ملا محمد آمین، ملا عبدالرشید بینوا، ملا فطرتی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

عہد جہانگیر: اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر ۱۶۰۵ سے لیکر ۱۶۲۷ء تک تخت نشین

ہوا۔ جہانگیر کے عہد میں علم وفن اور شعروسخن کے ذوق کو کچھ اور ترقی نصیب ہوئی۔ جہانگیر کو فارسی شاعری کا ذوق تھا اور وہ شعر بھی کہتا تھا۔ اسکے علاوہ تصنیف وتالیف سے بھی اسے دلچسپی تھی۔ اس کی ''تزک'' اسکے ذوق نظر کا ثبوت ہے۔ شعراء وعلماء کا وہ قدر داں بھی تھا۔ ان کے دور کے امراء مثلاً غازی خان، حیات خان، آصف خان، عبدالرحیم خانِ خانان وغیرہ شعروادب سے شغف رکھتے تھے۔ جہانگیری عہد کے مشہور کشمیری شعراء میں ملا ذہنی کشمیری، خواجہ حبیب اللہ، ملا فہمی، روشن کشمیری، فروغی کشمیری، فطرتی کشمیری، خورم کشمیری، ملا جوہر ناتھ، ملا حید ربن خواجہ، ملا کمال الدین، شیخ مہدی سوپوری، ملا علی سپتک، بابا نصیب الدین غازی، قاضی ابوالقاسم، ملا حبیب میر عدل سرفہرست ہیں۔

عہد شاہجہاں: جہانگیر کی وفات کے بعد شاہجہاں ۱۶۲۸-۱۶۵۸ء تخت نشین ہوا۔ کشمیر میں شاہجہان کا عہد علمی، تہذیبی، اور خاص طور پر ادبی نقط ءنظر سے بہت درخشاں رہا ہے۔ ایران سے فارسی کے علما وشعراء جو جہانگیر اور اس کے بعد، شاہجہاں کی سخن پروری اور سرپرستی کا شہرہ سن کر ہندوستان آتے تھے وہ کشمیر ضرور آتے اور بعض یہیں رہے اور یہاں ہی ان کا انتقال ہوا۔ شاہجہاں کے عہد میں احسن اللہ بیگ المخاطب بہ ظفر خان احسن کشمیر میں نائب ناظم مقرر ہوکر آیا تو اس کی سخن دوستی اور سرپرستی کی وجہ سے ایران کے تقریباً سارے اچھے اچھے شاعر اور ادیب کشمیر آئے۔ ان میں کئی شعراء وادبا جیسے صائب تبریزی، کلیم کاشانی، قدسی مشہدی ایسے تھے جن کا مقام اس عہد کے فارسی سخن سنجوں میں بلند تھا۔ ان کے کشمیر میں قیام سے شعری اور ادبی معیار بلند ہوتا گیا۔ جو شعراء اور علما ء قیام کشمیر کے زمانے میں احسن کے ساتھ منسلک رہے تھے۔ پہلے دور میں صائب اور میر الہیٰ کے علاوہ مولانا حیدر خصالی، قاضی ابو القاسم المعروف بہ قاضی زادہ، محمد مقیم جوہری، میر معصوم کاشانی، ابوطالب کلیم، میرزا جلا طبا طبائی، مولانا رونقی احمد، اور جان محمد قدسی اسکی شعروسخن کی محفلوں کے روح رواں تھے۔

دوسرے دور کے علماء اور شعراء میں مرزا حسین ،ملا منعمی ، وحشی اُنسی ،مرزا ابو طالب کلیم ،میرزا محمد قزوینی ،سید صوفی اور میر محمد باقر علوی کے نام سرفہرست ہیں اس کے علاوہ ،طغرا مشہدی ،عنایت اللہ خان آشنا ،غنی کشمیری ، ملا محمد زمان نافع ، فروغی ، ملا فصیحی ، عبدالرسول استغنا جیسے شعراء کا شمار بھی اس دور میں ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ ملا محسن فانی کشمیری اس دور کے علماء اور اساتذہ فارسی میں بہت شہرت رکھتے تھے۔ شیخ یعقوب صرفیؒ اور بابا داود خاکیؒ کے بعد یہ مرتبہ بہت کم شاعروں کو ملا۔ فانی عالم تھے۔ شاعر تھے۔ شیخ یعقوب صرفیؒ کی خدمت میں انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ جن شعراء نے اس دور میں نظامی گنجوی کی تقلید میں خمسہ لکھا ان شعراء میں ملا محسن فانی کشمیری اور محمد اشرف یکتا کشمیری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

عہد اورنگ زیب: شاہجہاں کی وفات کے بعد اورنگ زیب (۱۶۵۸-۱۷۵۲ء) تخت نشین ہوا۔ سیاسی کشمکش کے لحاظ سے اس کا دور اہم رہا ہے۔ وہ ایک عالم اور علم دوست بادشاہ تھا۔ اورنگ زیب کا دور فارسی شعر و ادب کی ترقی کی رفتار بتدریج ترقی پذیر تھی۔ یہاں تک کہ اس کے زمانے میں کشمیر کو علمی اور ادبی مرکزیت حاصل ہو چکی تھی۔ اس کے سربرآوردہ شعراء میں عبدالغنی بیگ قبول، لالہ ملک شہید، ملا محمد رضا مشتاق، عنایت خان آشنا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم اس دور کے خمسہ نویس شعرا کی بات کریں کہ جنہوں نے نظامی گنجوی کی تقلید میں خمسہ لکھا تو ان شعراء میں بینش کشمیری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

افغان دور: افغان دور جسے احمد شاہ دورانی کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ کشمیر میں یہ چوتھا خاندان تھا۔ جس نے مغلوں کو شکست دے کر ۱۷۵۲ء سے لے کر ۱۸۱۹ء تک کشمیر پر حکومت کی۔ احمد شاہ دورانی نے ۱۷۵۱ء میں اپنے سپہ سالار عبداللہ خان ایشک اقاصی کو کشمیر کی تسخیر کے لیے بھیجا۔ اس نے ۱۷۵۲ء میں کشمیر کو مسخر کیا۔ عبداللہ خان ایشک اقاصی نے مغل ناظم کشمیر ابوالقاسم کو ۱۷۵۲ء میں شکست دی تھی اور پھر کشمیر کا پہلا ناظم

۱۷۵۲ء میں بنا۔اس نے کوئی چھ مہینے حکومت کی ۔ یہ بڑا سخت حکمران تھا۔تو اس طرح کشمیر میں ۷۶ سال تقریباً ۸۲ گورنروں نے حکومت کی۔ یہ تمام گورنر نہ صرف پٹھان مسلمان بلکہ ان میں ہندو بھی تھے۔ جیسے سُکھ جیون مل 1167۔1175ھ تک گورنر رہا۔افغان جو ہنر مند سپاہی تھے لیکن حکومت کا کوئی تجربہ نہیں رکھتے تھے۔اس دور کے بادشاہ، احمد شاہ ابدالی (1752۔1772)، تیمور شاہ(1772۔1793)،زمان شاہ(1793۔1800)،اور محمود شاہ شجاع الملک(1801۔1819) ہیں۔احمد شاہ ابدالی کے دور میں تقریباً دس گورنروں نے کشمیر پر حکومت کی۔اسطرح احمد شاہ ابدالی کے دور سے لے کر محمود شاہ شجاع الملک کے دور تک کشمیر میں ۸۲ گورنروں نے یکے با دیگرے حکومت کی اور آخری گورنر سردار جبار خان 1234ھ بنے تھے اور اسکے بعد افغان حکومت کشمیر سے ختم ہوگئی۔افغان دور کشمیر کے لیے مشکل دور گذرا تھا کیونکہ اس دور میں کشمیر کے لوگوں کی زندگی کے تمام پہلو متاثر ہوئے۔لیکن اس بے ضابطگی کے باوجود فارسی زبان وادب نے ترقی کی اس دور کے شعراء جیسے شایق،بلبل،عطا اللہ،شاہ آبادی وغیرہ کا فارسی ادب میں بڑا حصہ رہا ہے۔ افاون حکمران بڑے ظالم اور جابر تھے۔لیکن کئی افغان گورنر فارسی زبان وادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔کشمیر کے ان گورنروں میں سے سُکھ جیون مل علم دوست،خوش اخلاق اور قدر شناس تھا۔فارسی شعر و ادب سے کافی لگاؤ رکھتا تھا۔وہ خود بھی ایک احساس مند شاعر تھا۔ایک شاعر ہونے کے اعتبار سے شاعروں،عالموں اور فاضلوں کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اس نے سات نمائدہ شعراء کا انتخاب کیا اور شاہنامہ لکھوانے کا کام شروع کیا۔سُکھ جیون مل پہلا شخص تھا جس نے کشمیر میں انجمن شعراء کو تشکیل دی۔مولوی توفیق کو اپنا ملک الشعراء اور رئیس انجمن مقرر کیا۔راجہ سُکھ جیون مل نے انجمن شعراء کی بنیاد رکھی۔تا کہ کشمیر کی تاریخ شاہنامہ کی طرز پر لکھی جائے۔ ان شعرا میں ملا توفیق کشمیری، ملا عبدالوھاب شایق،محمد جان بیگ خان سامی، ملا محمد رفیع، ملا علی جان متین، رحمت اللہ بانڈی نوید، ملا حسن راجح قابل ذکر

ہیں۔

ملا توفیق کور یاست کے شعراء کا صدر مقرر کیا گیا تھا۔ ملا توفیق صاحب دیوان تھا۔ ان کے اس دیوان میں قصائد، غزلیات، مثنویات، قطعات کے علاوہ جو شاہنامہ کشمیر سُکھ جیون مل کی فرمائش پر منظوم کیا جا رہا تھا۔ اسکے لیے دو ہزار اشعار کہے تھے جو اسمیں موجو دہیں۔ بدقسمتی سے سُکھ جیون مل آنکھوں کے اندھا ہوجانے کی وجہ سے اسکا شاہنامہ مکمل نہیں ہوسکا۔ اس کے علاوہ عبدالوھاب شایق بھی افغان دور کا مشہور شاعر تھا۔ شایق نے تاریخ کشمیر کے لیے جو حصہ منظوم کیا تھا وہ ہزار صفحات سے زائد ہے۔ اس کا نام انھوں نے ''ریاض الاسلام'' تجویز کیا۔ رکن دوم میں ریشیوں کے حالات لکھے ہیں۔ نظم کے دوران کچھ حکایتیں نثر میں بھی لکھی ہیں۔ اسی طرح باقی شعرائکو بھی ایک ایکعہد دیا گیا تھا لیکن کچھ نے ہی مکمل کیا تھا۔ افغان دور کشمیر میں فارسی زبان وادب کی ترقی کے حوالے سے کافی شناخت رکھتا ہے۔ اس دور کے مشہور شاعر میر سعداللہ شاہ آبادی ہیں۔ ان کی مشہور مثنوی ''باغ سلیمان'' ہے۔ ''منظوم السعد'' سیرت نبویؐ پر میر سعداللہ شاہ آبادی کی ایک اور طویل مثنوی بھی ہے۔

افغان دور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس دور میں تاریخ کو نظم میں لکھا گیا تھا۔ اس دور کا مشہور و معروف شاعر ملا محمد اشرف دیری بلبل اس عہد کے صاحب دل اور صاحب نظر شعراء میں سے ہیں جنھوں نے نظامی گنجوی کے خمسہ کے جواب میں خمسہ لکھا تھا۔ بلبل پہلا شخص ہے جس نے داستان شہدا کربلا کا قصہ درد وسُوز سے بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے انہیں ''نظامی کشمیر'' کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اس دور کے ایک اور مشہور شاعر عبدالغفور شوپیانی ہیں جنھوں نے نظامی گنجوی کے جواب میں خمسہ پنج گنج کے نام سے لکھا ہے۔ ان کا پنج گنج دو ہزار چار سو ابیات پر مشتمل ہے۔ پنج گنج کا نسخہ خطی جموں وکشمیر اینڈ پبلیکیشن آرگنائزیشن کی لائبریری میں نمبر 17 کے تحت رکھا گیا ہے۔ فارسی علوم وترقی کے لحاظ سے کشمیر میں اسکی بڑی قدر ہے۔

سکھ دور: افغان حکومت 1752ء سے لے کر 1819ء تک کشمیر میں قائم رہی۔ اسکے بعد سال 1819ء میں سیکھوں نے کشمیر سے افغان حکومت کو ختم کر دیا۔ اسطرح کشمیر سے افغان حکومت کے خاتمے کے بعد کشمیر سیکھوں کے زیر تسلط 1846ء تک رہا تھا۔ سیکھوں نے کشمیر پر تقریباً 28 سال تک حکومت کی۔ سیکھ دورے آغاز میں کشمیر کے لوگ خوش تھے کہ اب وہ ظلم و جبر سے آزاد ہو چکے ہیں۔ کیونکہ افغان دور کشمیری عوام کے لیے کافی مشکل دور گزرا تھا۔ اسلیے کہ اس دور میں کشمیری عوام کی زندگی کے تمام پہلو متاثر ہوئے تھے۔ بدقسمتی سے سیکھوں کا دور کشمیریوں کے لیے افغان دور سے بھی زیادہ مشکل دور ثابت ہوا۔ اس دوران کشمیر میں ظلم اور زیادتی کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ اسکے بارے میں کشمیر کے ایک خمسہ نویس ملا حمید اللہ شاہ آبادی فرماتے ہیں۔

جرم ما، ما را جو دامن گیر شد قوم سکھان وارد کشمیر شد

کور سنگ حاک ورنجیت چو باشد سلطان شکوہ از جور مکن عالم کورا کوری است

یہ دور کشمیر کی تاریخ میں سب سے زیادہ ہنگامہ خیز ثابت ہوئے۔ اسکے علاوہ انہوں نے علم ودانش میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ اسی لیے سیکھوں کے دور میں تمام ادبی وفرہنگی قدریں مسدود ہو کر رہ گئیں۔ عالموں، فاضلوں اور شاعروں کو جو جاگیریں اس سے ما قبل حکومتوں نے عطا کی تھیں وہ اُن سے چھین لی گئیں تھی۔ فارسی زبان وادب کے حقیقی زوال کی ابتداء اگر اسی دور کو تصور کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ شیخ غلام محی الدین اور شیخ امام الدین کے سوا سبھی سِکھ گورنر علم وادب کے ذوق سے عاری تھے۔ اگر چہ یہ خود بھی عالم وفاضل تھے اس دور میں اگر کچھ اضافہ ہوا تو اس کا سہرا اِنہی کے سر جاتا ہے۔ اس دور کے شعراء، علما وادباء میں مرزا مہدی مجرم، خواجہ شاہ نیاز نقشبندی، شیخ طیب رفیقی، ملا عبیداللہ، میر محی الدین مہدی اکمل، مصطفٰے خان بتوں ر، بابا محمد کاظم، شیخ احمد تارا بیلی، خواجہ امیر الدین پکھلی وال وغیرہ کے علاوہ پنڈت شعراء میں بیربل کاچرو، پنڈت بھونی داس کاچرو نیکو، پنڈت کمندرام ہندو، پنڈت تابہ رام ترکی، شنکر جیو آخون گرای،

نارائن داس خمیر اور لچھمن رام سرور نے شہرت حاصل کی۔

لیکن اس سیاسی، ثقافتی و تہذیبی بے ضابطگی کے باوجود کشمیر میں فارسی شعر وادب پروان چڑھا۔ جیسا کہ گزشتہ ادوار میں کثرت سے فارسی کے شعراء، علماء وادبا پیدا ہوئے ان میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی تھے جو فارسی زبان وادب کو پسند کرتے تھے۔ اسی طرح اس دور میں بھی گذشتہ ادوار کی طرح کچھ شعراء خمسہ نویسی کی طرف متوجہ ہوئے ان میں ملا بہاالدین متو اور حمید اللہ شاہ آبادی قابل ذکر ہیں جنھوں نے نظامی گنجوی کے خمسہ کا جواب لکھا۔ کشمیر میں خمسہ نویسی کی روایت دسویں صدی ہجری یعنی چک دور سے شروع ہوئی تھی اور اس دور میں خمسہ نویسی کی بنیاد رکھنے والے بہت بڑے مشہور و معروف صوفی شاعر شیخ یعقوب صرفیؒ ہیں جنھوں نے نظامی گنجوی کے خمسہ کی تقلید میں کشمیر میں سب سے پہلے خمسہ لکھا۔ اسطرح وہ کشمیر میں خمسہ نویسی کے بنیاد گذار شاعر گزرے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے شعراء جنھوں نے کشمیر میں مختلف ادوار میں نظامی گنجوی کی تقلید میں خمسہ لکھا ان شعراء میں ملا محسن فانی کشمیری، یکتا کشمیری، بلبل کشمیری، عبدالغفور شوپیانی۔ ملا حمید اللہ شاہ آبادی، ملا بہاوالدین متو، سنا اللہ خراباتی، بدری کشمیری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کتابیات:

۱۔ بہارستان شاہی نسخہ خطی ورق ۶

۲۔ کشیر جی۔ ایم۔ ڈی۔ صوفی

۳۔ مجلہ دانش شمارہ ۷ کشمیر یونیورسٹی

۴۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ

۵۔ ملا حمید اللہ شاہ آبادی کشمیر کا ایک فارسی مثنوی نگار

☆☆☆

Tahqeeq ka Tariqa-e-kaar by Dr. Iram Jahan (Asst. Prof. dept. of Urdu
Gandhi Faiz-e-aam college Shahjahan Pur) cell-9368834055
ڈاکٹر ارم جہاں (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہء اردو، گاندھی فیض عام کالج، شاہجہاں پور)

تحقیق کا طریقۂ کار

تحقیق کا اعتبار سے مفہوم یہ ہے کہ ادبی تخلیقات کو چھان پھٹک کر ان میں نہ صرف صحت مند عناصر کی دریافت کی جائے بلکہ کلاسیکی ادب کے ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کو منظر عام پر لایا جائے اور ساتھ ہی جدید ادب کے قلم کاروں کے بھی عیوب و نقائص کے ساتھ ان کی فنی خوبیوں کا بھی غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے۔ نئی باتوں کی دریافت اور ایسے مسائل کی نشاندہی بھی ضروری ہے جو نئے محققین اور اسکالز کے لیے مفید ہو اور جس کی مدد سے وہ اپنے تحقیقی کاموں کو جلا دے سکیں۔ تحقیقی کام خاصا مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ قوت برداشت اور تحمل کا مادہ نہ ہو تو کوئی بھی محقق اپنے تخلیقی کام کو صحیح ڈھنگ سے انجام نہیں دے سکتا۔

اقربا پروری، دوست احباب کا خیال، اپنے شناسا قلم کاروں کے ساتھ جانبداری برتنا تحقیقی کاموں میں سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ اس کام میں پوری طرح سرخرو اور کامیاب نہیں ہو پاتے۔ لوہے کے چنے چبانا شاید سہل ہو، بلند ترین پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کرنا ان پر اپنی کامیابیوں کے جھنڈے قائم کرنا بھی شاید آسان ہو لیکن ایمان داری، محنت، لگن اور شوق کے ساتھ تحقیق کے کام کو پایۂ تکمیل

تک پہنچانا خاصا دشوار اور مشکل کام ہے۔

اردو میں تنقید نگاروں اور محققین کی کسی زمانے میں کمی نہیں رہی ہے۔ اردو میں بہت سے اہم محققین کی ایک طویل فہرست پیش کی جا سکتی ہے جنہوں نے اپنے عظیم کارناموں سے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق ایک ایسے ہی جید عالم اور عظیم محقق تھے جنہوں نے قدیم اور کلاسیکی ادب اور ان میں بھی خصوصاً دکنی ادب کی بہت سی اہم اور معروف کتابوں کو بڑی محنت، جانفشانی اور دیدہ ریزی سے ترتیب دے کر انہیں شائد کیا۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر محی الدین قادری روز، مالک رام، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر عبدالقادر سروری، رشید حسن خاں، حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی عبدالودود، علامہ نیاز فتح پوری، سید وقار عظیم، سید سجاد ظہیر، مولانا امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر مسیح الزماں، پروفیسر مجنوں گورکھپوری وغیرہ کا شمار بھی اردو کے اہم محققین میں ہوتا ہے۔ ان علمائے ادب نے بہت سی قدیم روایات اور نظریات پر تحقیق کر کے اصلیت اور واقعت کو عام کیا اور لوگوں کو ان ادبی کتابوں سے روشناس کرایا۔

اس سلسلے میں ملک کی بہت سی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں نے بھی بہت اہم کارنامے انجام دیے اور تحقیق و تدوین کے بعد اردو کے عظیم ادبی جواہر پاروں کو شائع کیا۔ آج بھی بہت سے قابل اساتذہ کی نگرانی میں تحقیقی کام انجام دیے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب 'ارمغان خاطر' پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے نہایت اہم تحقیقی کام کیا اور مولانا آزاد نے اپنے خطوط میں جو اردو فارسی کے اشعار لکھے تھے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے نہایت تحقیق کے ساتھ ان سبھی اشعار کے مآخذات بھی تحریر کیے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اردو کی ایک نابغہ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں رہ کر کئی تحقیقی کام انجام دیے۔ خاص طور

سے پروفیسر رشید احمد صدیقی پر ان کی تحقیقی کتاب بہت اہمیت رکھتی ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے ترقی پسند ادب پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ایک اہم کارنامہ انجام دیا۔ تحقیقی کاموں کا مستقبل نہایت روشن اور درخشاں ہے اور اس سلسلے میں دن بہ دن زیادہ وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی جارہی ہے۔ ادب کی دنیا میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی کتاب 'ہماری شاعری' بھی کافی مشہور ہوئی۔ یہ کتاب ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی معروف تحقیقی اور تنقیدی کتاب 'مقدمہ شعر و شاعری' میں جو مباحث اٹھائے تھے اور شاعری کے سلسلے میں جن اصطلاحات کی سفارش کی تھی یہ کتاب ان مباحث کے رد کے طور پر لکھی گئی تھی۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مولانا حالی کی کتاب 'مقدمہ شعر و شاعری' میں کچھ باتیں یک طرفہ اور غیر متوازن طور پر بیان ہوئی ہیں۔ اس لیے مسعود حسن رضوی ادیب نے تحقیق کے نقطۂ نظر سے اس میں کچھ مزید اضافے کیے اور کئی جگہ حالی کے نظریات و خیالات سے بحث بھی کی۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی کتاب 'ہماری شاعری' میں اعتدال اور توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی اور ادب و سماج میں رائج بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا گیا۔ انجمن ترقی اردو بیورو نے اس کی قدر و منزلت میں کافی حصہ لیا اس لیے یہ کتاب چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ اس کے اب تک متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس سے مولانا حالی کی کتاب کی اہمیت رتی برابر بھی کم ہوئی ہو۔

مولانا حالی کا کام اپنی جگہ اہم ہے اور ہزار کوششوں کے باوجود 'مقدمہ شعر و شاعری' کی اہمیت و افادیت کبھی کم نہیں ہوسکتی کیوں کہ وہ تنقید کا پہلا پتھر ہے جس کا اعتراف اردو ادب کے سبھی ادیبوں نے کیا ہے۔ بہر حال پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کا تحقیقی کام یہیں نہیں رکا اور انہوں نے کئی قدیم کتب اور کلاسیکل ادب کے شہ پاروں کی تحقیق و تدوین کی اور ان کو شائع کرایا۔ ان کتابوں میں ذکر میر، دیوان

جائز، روح انیس، اندر سبھا وغیرہ کے نام خاص طور سے لیے جا سکتے ہیں۔ ان کتابوں کی تدوین کے ساتھ آپ نے نہایت فاضلانہ اور طویل مقدمے بھی لکھے اور ان میں بھی ذکر میر اور دیوان فائز کے مقدمات اپنی تحقیق و تنقید اور علمی و ادبی شان کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

فائز کا دیوان بڑی اہمیت کا حامل تھا اور یہ بات یہاں تک کہی جاتی ہے کہ اگر پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی ترتیب و تدوین پر توجہ نہ دیتے تو بہت ممکن تھا کہ زمانہ کی دست برد کے باعث یہ کبھی کا تلف ہو گیا ہوتا۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اہم کتاب 'اردو ڈرامہ اور اسٹیج' ہے۔ اس کتاب نے تحقیقی لحاظ سے ڈرامہ اور اسٹیج کے بارے میں اردو ادب کی ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ڈرامہ اور اسٹیج کی تاریخ بھی بیان کی ہے اور اس کا سیر حاصل اور تفصیلی جائزہ بھی لیا ہے۔ اردو ڈرامہ کے سلسلے میں ادوار کے لحاظ سے جو تبدیلیاں اور ترقیاں ہوئیں، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے اس کا مرحلہ وار بیان کیا ہے۔

تحقیق کی دنیا میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین بھی ایک اہم نام ہے۔ ان کی مشہور و معروف تصانیف میں مختصر تاریخ ادب اردو، نئے ادبی رجحانات، آئینہ معرفت، مذہب اور شاعری، ملک ادب کے شاہزادے اور یادوں کی دنیا کو بہت اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے۔ پروفیسر سید اعجاز حسین کی کتاب 'مختصر تاریخ ادب اردو' اردو ادب کا اسکالرز، محققین، طلبا اور مصنفین کے لیے ایک بے مثال اور لاجواب تحفہ ہے۔ اس میں ایسی اہم اور ضروری معلومات کو یکجا کر دیا گیا ہے جن سے سبھی بہتر طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح انہوں نے اپنی ایک اور اہم کتاب 'نئے ادبی رجحانات' میں بڑی کوشش و کاوش اور تحقیق سے ادب کے تمام رجحانات اور تناظرات کا احاطہ کیا ہے اور اس پر سیر حاصل بحث کر کے مثبت نتائج بھی پیش کیے ہیں۔ یہ بڑی اہم بات ہے کہ ادب کے نئے رجحانات سے واقفیت حاصل کرنا، ان کے جانچنے پرکھنے اور ان سے کسی حد تک

مستفید ہونے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر اور ضروری ہوگا۔اسی طرح مذہب اور شاعری کے موضوع پر ان کی کتاب انفرادیت رکھتی ہے۔ان کی یہ انوکھی اور اہم تصنیف ایک بڑے اور خاص موضوع کی نشاندہی اور اس کا احاطہ کرتی ہے۔

پروفیسر مجنوں گورکھپوری بھی اردو تحقیق کے ایک قدآور ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی مشہور و معروف تصانیف میں اقبال،نقوش و افکار، پردیسی کے خطوط اور نکات مجنوں کی بڑی اہمیت و افادیت ہے۔مجنوں گورکھپوری اپنی عالمانہ و فاضلانہ تحریروں کے باعث تحقیق،تنقید اور ادب کی دیگر اصناف میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

اردو میں تحقیق اور تنقید کو الگ نہیں کیا جا سکتا تاہم تخلیق کے بعد تحقیق اور اس کے بعد تنقید کا نمبر آتا ہے۔غالباً اسی لیے اردو کے معروف نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنی مشہور کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر' کی ابتدا ہی اس جملہ سے کی۔'اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے، یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر ہے۔'ان کے اس جملے پر خاصے اعتراض کیے گئے اور یہ بھی کہا گیا کہ اس سے ان کے انتہا پسندانہ رویہ اور یک طرفہ رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ان کے اوپر یہ بھی اعتراض ہے کہ اگر اردو میں تنقید کا وجود محض خیالی یا فرضی ہے یعنی ہے ہی نہیں تو پھر انہیں خود تین چار سو صفحات کی کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر' لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی!

بہر حال محققین کی ایک طویل فہرست میں پروفیسر سید احتشام حسین کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔انہوں نے تحقیق کے ساتھ تنقید بھی لکھی اور اس کے علاوہ دیگر متعدد اصناف میں بھی اپنی تخلیقات پیش کیں۔ان کی اہم کتابوں میں تنقیدی جائزے، روایت اور بغاوت، ادب اور سماج، تنقید اور ملی تنقید، ذوق ادب اور شعور، عکس اور آئینے، افکار و مسائل، اعتبار نظر وغیرہ کافی مشہور ہیں۔اسی طرح پروفیسر آل احمد سرور بھی اردو تحقیق و تنقید میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

ان کے دو شعری مجموعوں ''سلسبیل'' اور ''ذوق جنوں'' کے علاوہ تحقیقی اور

تنقیدی کتب بھی شائع ہوئیں جن میں سے کچھ کے نام ہیں: تنقیدی اشارے، نئے اور پرانے چراغ، تنقید کیا ہے، ادب اور نظریہ، مسرت سے بصیرت تک وغیرہ۔ پروفیسر آل احمد سرور اردو تحقیق وتنقید کے بلند ستونوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے ان دونوں فنون میں اپنی ایک الگ راہ نکالی اور اس کے سبب اردو کے علمی وادبی حلقوں میں ان کی خوشگوار پذیرائی اور عزت افزائی ہوئی۔ ان کی تحقیق اور تنقید کا پس منظر اور اس کے تناظرات بہت وسیع ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں توازن بھی ہوتا ہے کیوں کہ تحقیق ہو یا تنقید، انہوں نے کسی میں انتہا پسندانہ اور پروفیسر کلیم الدین کی طرح ضدی رویہ اختیار نہیں کیا۔ وہ دیگر محققین اور نقادوں کی طرح مشکل فلسفیانہ انداز و اسلوب اور اصطلاحات سے اپنی تحریروں کو بوجھل نہیں ہونے دیتے بلکہ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں وہ نہ صرف مدلل ہوتا ہے بلکہ اسلوب کے لحاظ سے اتنا واضح اور صاف ہوتا ہے کہ قاری کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں سے عوام وخواص دونوں بہرہ یاب ہوتے ہیں اور طالب علموں کے لیے تو ان کی تحریریں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور اردو ادب میں اتنی اہمیت وشہرت رکھتے ہیں جو کئی دوسرے ادیبوں کے حصے میں کم ہی آئی ہے۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی، ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی، پروفیسر قمر رئیس، علی جواد زیدی کے علاوہ موجودہ وقت میں شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر سید محمد عقیل، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر عبدالرشید، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر مظفر حنفی وغیرہ کے تحقیقی کاموں سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ہر شخص گویا ایک دبستان، ایک ادارہ، ایک اسکول اور ایک مکتب کی حیثیت رکھتا ہے۔ موجودہ وقت میں بے شمار تحقیقی کام کیے جا رہے ہیں جن میں بہت سی یونی ورسٹیوں کے اساتذہ کے ساتھ لائق وفائق طالب علم بھی شامل ہیں۔ تخلیق کے ساتھ ہمیں تحقیق اور تنقید کی کیوں ضرورت ہوتی ہے، تحقیق وتنقید کی غرض وغایت کیا

ہے اور اس سے کیا فائدہ حاصل ہوتا یا ہوسکتا ہے، اس بابت یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''کہا جاتا ہے کہ تخلیق و تنقید کا رشتہ اٹوٹ ہے اور تنقید کا سلسلہ اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے جس لمحہ تخلیق جنم لیتی ہے اور یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ تخلیق کا سب سے پہلا ناقد خود تخلیق کار ہوتا ہے۔ شعر کی سماعت، داد و تحسین، مشاعرے، مذاکرے، یہ سب کے سب تنقید کے ابتدائی نمونے تسلیم کیے جاتے ہیں جہاں سے تلاش حق کے سلسلے شروع ہو جاتے ہیں تو پھر تحقیق کے نمونے کیوں نہیں ملتے جبکہ تحقیق بھی حق کی تلاش کا نام ہے۔ بقول رشید حسن خاں حقائق کی بازیافت تحقیق کا مقصد ہے۔ قاضی عبدالودود کی زبان میں اسے یوں بھی کہا گیا ہے کہ تحقیق کسی امر کو اسی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے تو یہ کوشش بھی اسی وقت سے شروع ہو جانی چاہئے جب سے تخلیق جنم لے لیکن اردو میں تحقیق کا مزاج ہی بالکل الگ اور عجب سا رہا ہے اسی لیے اس کی ابتدا اوپر سے ہوئی۔''

(تحقیق کی محرومیاں، پروفیسر علی احمد فاطمی، ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جون ۲۰۰۰، ص: ۱۳)

تحقیق اور تنقید کی بابت یا اس کی بحث و تمحیص کے سلسلے میں پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

''یہ کہنا تو درست نہ ہوگا کہ ادبی تحقیق کی جانب باقاعدہ توجہ کی شروعات بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو میں تحقیق کو کوئی ایسا مقام حاصل نہیں تھا جس پر فخر کیا جا سکے۔ تذکرے جن سے اس کی امید ہو سکتی تھی، تحقیق کا کوئی قابل ذکر نمونہ پیش نہ کر سکے۔ اگر سرسید کی آثار الصنادید کو نظر انداز کر دیا جائے جو ایک خاص نوع کا علمی اور تحقیقی کارنامہ ہے تو اردو کا دامن بہت دنوں تک فراہمی مواد اور ترتیب و تدوین کتب کے نقطۂ نظر سے خالی نظر آتا ہے۔ ہمارے اہم ترین عالموں اور مصنفوں نے بھی تحقیق کا کوئی معیار قائم نہیں کیا۔ ہاں ان کے بعد خاص طور سے مستشرقین کے خیالات عام ہونے کی وجہ سے اردو میں تحقیق کی راہیں کھلنے لگیں۔''

(اردو میں تحقیق آزادی کے بعد، پروفیسر احتشام حسین، ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جون

۲۰۰۰،ص ۱۳۔ ۱۴)

تحقیق ایک مشکل امر ہے۔اس کے لیے محقق کا ہوشیار ہونا ضروری ہے۔اس کے اندر محنت کرنے کا مادہ ہو،حقائق کو پیش کرنے کی ہمت و جرأت ہو،انصاف پروری اس کے مزاج کا خاصہ ہو،اقربا پروری اور دوستی جیسے جذبات سے عاری ہو یعنی وہ جو کچھ اور جیسا کچھ لکھے وہ صرف غیر جانبداری پر مبنی ہو۔اچھی تحقیق تبھی معرض وجود میں آسکتی ہے جب محقق ایماندارانہ طور پر اس کو انجام دے۔اس کے اندر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کی ہمت و صلاحیت ہو اور تحقیق کا معیار و مرتبہ کیا ہو۔اس بابت مزید وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''یہ ٹھیک ہے کہ سرسید اور ان کے بعد عبدالحلیم شرر کے بعض معرکتہ الآرا تحقیقی کاموں کے بعد یہ سلسلہ مولانا سلیمان ندوی،محمود شیرانی،عبدالحق اور پھر ان کے بعد امتیاز علی عرشی، مالک رام،مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالودود،محی الدین قادری زور وغیرہ سے ہوتا ہوا گیان چند جین اور رشید حسن خاں تک پہنچتا ہے اور ایک اچھا سرمایہ اور ایک اچھی روایت قائم ہوتی ہے۔چنانچہ آج تحقیق کے نام پر ہزاروں صفحات ہماری نظروں کے سامنے ہیں تاہم اردو تحقیق کا وہ معیار، وہ وقار اور وہ چلن عام نہ ہوسکا جو تنقید و تخلیق کا ہوا،آخر کیوں؟

اس کے اسباب ہوسکتے ہیں!ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ بقول احتشام حسین:'یہ صنف مشکل ہے اور صبر آزما بھی۔تحقیق جس قسم کی ریاضت، دیدہ ریزی اور دقت نظر کا مطالبہ کرتی ہے اس کے لیے بہت تھوڑے سے لوگ موزوں ہوسکتے ہیں۔'اور آگے وہ اس بھی زیادہ اہم اور معنی خیز بات لکھتے ہیں کہ بہت تھوڑے سے محققین حقائق کی تلاش، حقائق کی اہمیت، تجزیہ یا شہادتوں کی نوعیت،مختلف علوم اور متعلقہ مسائل کی مدد سے اخذ نتائج اور اس کے ساتھ ہی نتائج کی ادبی اہمیت کا صحیح شعور رکھتے ہیں۔''

(تحقیق کی محرومیاں، پروفیسر علی احمد فاطمی،ص ۱۴)

تنقید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن تحقیق کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس میں پوشیدہ حقائق کو سامنے لانا ہوتا ہے اور اس میں سچائی اور غیر جانبداری اور ایمانداری شرائط اولین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بہرحال تحقیق اردو محققین کی نظر میں بندشوں اور پابندیوں کا ہی نام ہے۔ اس کے لیے بہتر ہے کہ رشید حسن خاں کے جملوں اور ان کے نظریات سے استفادہ کریں، وہ لکھتے ہیں:

''محقق تحقیق کے مسلمہ ضابطوں پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہے۔ وہ جب بھی ان ضابطوں سے کترا کر چلے گا اس کی بات قابل قبول نہیں رہے گی۔ اس کی دلی خواہش کیا ہے، عقیدہ کیا ہے اور شہادت یا حقائق کیا کہتے ہیں، یہ دو مختلف باتیں ہیں۔ وہ پسندیدہ ذوق کی تلاش کے بجائے حقائق کی شہادت کو قبول کرنے اور انہی نتائج کو پیش کرنے پر مجبور ہے۔ خواہ اس کے عقیدے کتنے ہی خلاف ہوں۔ اپنے منصب کے اعتبار سے نقاد اور محقق دونوں ایک ہی درجے کے ہوتے ہیں۔ دونوں کے یہاں اگر بے لاگ کھرا پن نہیں تو کچھ بھی نہیں اور یہ کھرا پن دہری شخصیت سے میل نہیں کھاتا۔''

(تلاش و تعبیر رشید حسن خاں، ص:۱۱۔ دہلی اردو اکادمی ۱۹۸۸ء)

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تحقیق کا سفر اندھیرے میں طے نہیں ہو سکتا یعنی حقائق کے صرف نظر سے تحقیق میں کام نہیں چل سکتا۔ مواد کی فراہمی میں دشواری، ذرائع کی عدم فراہمی اور ماضی کی تاریکیاں مواد کی راہ میں حد فاصل بن جاتی ہیں یا ایک محقق کی راہ میں دیوار کی طرح حائل ہو جاتی ہیں جس کے باعث محقق اندھیرے میں بھٹکتا رہتا ہے۔ ان حالات میں تخلیق تک نہ تو آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے اور نہ اس کے تجزیہ و تحقیق کو بہتر طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

تحقیق ادب کی ایک ایسی نازک صنف ہے جہاں عرق ریزی کے ساتھ صبر آزمائی اور کشادہ ذہنی کو بروئے کار لانا ضروری ہوتا ہے۔ وسعت نظر، فراخدلی، حقیقت

کا بے باکانہ اظہار تحقیق کے وہ عناصر ہیں جن پر عمل کیے بغیر یا جن سے صرف نظر کر کے اچھی تخلیق عمل میں نہیں آسکتی۔ قاضی عبدالودود نے اس سلسلے میں ٹھیک ہی کہا ہے:

''محقق کا مطمع نظر یہ ہونا چاہئے کہ کم سے کم الفاظ میں پڑھنے والے پر اپنا مافی الضمیر ظاہر کر دے، یہ غلط ہی کیوں نہ ہو مگر اسلوب بیان ایسا ہو کہ شبہ کی گنجائش نہ رہے۔''

(تحقیق کی محرومیاں، پروفیسر علی احمد فاطمی، ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جنوری ۲۰۰۰، ص: ۱۵)

محقق کے لیے مواد اور پھر وہ بھی درست مواد کی فراہمی ایک بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ ایک ہی ادیب یا شاعر کی تاریخ ولادت و وفات، والدین کے نام، کتابوں کے نام، مقام پیدائش وغیرہ میں اتنے اختلافات پائے جاتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ کس محقق کا پایہ بلند ہے اور کس کے مآخذات درست اور صحیح ہیں اور دی گئیں معلومات کس حد تک بھروسہ مند اور قابل اعتبار ہیں۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اردو میں وہ سائنٹفک طریقے اختیار نہیں کیے گئے ہیں اور ان خطوط پر کام نہیں کیا گیا ہے جو انگریزی وغیرہ اعلیٰ زبانوں میں رائج ہیں۔ مغرب میں اشاریہ سازی یا ببلیوگرافی کا کام جس اعلیٰ پیمانے پر ہوتا ہے اس کا ہمارے یہاں ابھی تصور بھی محال ہے۔ اس سلسلے میں یہ اقتباس پیش کرنا ضروری اور ناگزیر معلوم ہوتا ہے:

''اول تو تحقیق کا کام ہمارے یہاں ابھی تک سائنٹفک ڈھنگ سے بہت کم کیا گیا ہے پھر ہمیں وہ آسانیاں بھی حاصل نہیں۔ اردو میں ببلیوگرافی تیار کرنا شاید کوئی اہم اور قابل قدر کام نہیں سمجھا جاتا اور سچ پوچھئے تو چند کتب خانوں کے علاوہ کسی کتب خانہ میں کیا ہے اس کا بھی علم نہیں۔۔۔۔۔۔ ہمارے پاس نہ کیمبرج ببلیوگرافی آف انگلش لٹریچر جیسی کوئی چیز ہے اور نہ منتھلی ریویو یا کوارٹرلی ریویو جیسی میگزین جو موضوعات اور کتابوں کی مکمل فہرست فراہم کر سکیں۔ اگر 'نوائے ادب' یا 'معاصر' جیسے دو ایک رسالے اردو میں نہ نکلنے لگیں تو محققین کی بہت کچھ مدد ہو سکتی ہے لیکن اردو میں ایسے رسالوں کا

مذاق ابھی زیادہ پیدا نہیں ہوا، نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے سرمائے کا خود صحیح علم نہیں ہو پاتا۔''
(مضمون: تحقیق اور مواد کی فراہمی کا مسئلہ، پروفیسر سید محمد عقیل، ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جون ۲۰۰۰، ص: ۱۵۔۱۶)

لیکن پروفیسر سید محمد عقیل کے خیالات کے برعکس اور قطع نظر اردو میں بلیو گرافی پر چودھری محمد نعیم، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر عبدالرشید، پروفیسر مظفر حنفی، ڈاکٹر محمد اطہر مسعود وغیرہ کی متعدد شاندار کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جو نہ صرف تحقیق کا حق ادا کرتی ہیں بلکہ ان سے محققین اور نئے ریسرچ اسکالرز کو استفادہ کرنے کا برابر اور بہترین موقع مل رہا ہے۔

جہاں تک رسائل کی بات ہے تو اردو میں اب ایسے رسائل بھی شائع ہو رہے ہیں جو اسکالرز کے لیے ہر ماہ یا ہر سہ ماہی پر سیر حاصل اور بہت سا مواد فراہم کرتے ہیں۔ ان ہی رسائل میں اردو بک ریویو کا نام سرفہرست ہے جو نہ صرف کتابوں پر تبصرے شائع کرتا ہے بلکہ نئی کتابوں کی فہرست بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔ ہر سال متعدد یونی ورسٹیوں میں جو طلبا اور طالبات ایم۔فل یا پی۔ایچ۔ڈی یا پھر ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں ان کی تفصیل بھی اس رسالہ میں دی جاتی ہے۔ اس کے مدیر عارف اقبال ہیں۔ اس کے علاوہ کولکاتا سے ڈاکٹر امام اعظم کا رسالہ تمثیل نو، دربھنگہ سے منصور خوشتر کا رسالہ دربھنگہ ٹائمز بھی ان ضرورتوں کو پورا کر رہا ہے۔

ان رسائل کے علاوہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا مظفر پور سے شائع ہونے والا سہ ماہی رسالہ کوہسار جرنل، دربھنگہ سے منصور خوشتر کا ایک اور سہ ماہی رسالہ ریسرچ جرنل، نند کشور وکرم کا عالمی اردو ادب دہلی، کولکاتا سے شائع ہونے والا ماہنامہ سہیل، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے دو رسالے اردو دنیا اور فکر و تحقیق، محققین اور ریسرچ اسکالرز کی ضرورتوں کو کافی حد تک پورا کرتے ہیں۔ یہاں معدودے چند رسائل کے ہی نام درج کیے گئے ہیں ورنہ ایسے اور بھی بہت سے رسالے ہیں جو طلبا کی ضرورتوں

کے پیش نظر ہی شائع کیے جاتے ہیں۔ان میں جموں یونی ورسٹی کا ترسیل اور مولانا آزاد نیشنل یونی ورسٹی کا ریسرچ جرنل بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔اس کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے بھی طلبا کی ضرورتوں کے لحاظ سے کئی اہم ریسرچ جرنل شائع کیے جاتے ہیں۔رام پور رضا لائبریری جرنل اور خدا بخش لائبریری جرنل بھی تحقیقی کاموں کے لحاظ سے اپنی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔یہ بات ہمیشہ یاد رہنی چاہئے اور س پر سب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ تحقیق میں حرف آخر کچھ نہیں ہوتا۔سب کے لیے تحقیق کے دروازے کھلے ہوتے ہیں لیکن یہ محققین کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ قارئین اور دیگر اسکالز کے لیے صرف صحیح اور درست معلومات ہی فراہم کریں۔اس سلسلے میں سید احتشام حسین کا یہ دلچسپ اقتباس خاص اہمیت کا حامل ہے:

''کہنا یہ ہے کہ ادب میں نئی باتیں تلاش کرنا،نئی معلومات بہم پہنچانا حقیقت کی تلاش کرنا محض چند محققین کا اجارہ ہے یا جو چند لوگوں نے اصول مرتب کر دیئے ہیں وہی حرف آخر ہیں،سراسر غلط ہے۔''عقیل صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے:'ادب کی دنیا میں ایسے لوگوں کو،جو یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں موضوع کو صرف وہی سمجھتے ہیں،اس سلسلے میں جتنی تحقیقات ہیں صرف وہی کر سکتے ہیں،اپنی کہی بات اس ضمن حرف آخر ہے،انہیں گھامڑ،کج فہم اور برخود غلط شخصیتوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔'

ترقی اور تبدیلی کا کارواں کبھی رکتا نہیں۔نت نئے علوم وفنون اور نئے اذہان ،حصول علم اور حقیقتوں کی تلاش کے راستے بدلتے رہتے ہیں۔تنقید نے یہ راستے اپنائے یہی وجہ ہے کہ آج وہ اک پُروقار،منفرد صنف ادب کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ تحقیق کی باضابطہ منفرد حیثیت نہیں ہے لیکن وقار واعتبار کی راہیں اسے بہر حال تلاش کرنی ہوں گی اور اپنے آپ کو محرومیوں وکمزوریوں کے اندھیروں سے نکالنا ہوگا،جہاں وہ ابھی تک گم ہے اور نئی روشنی کے بغیر اندھیروں سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔'' (مضمون :تحقیق کی محرومیاں ، پروفیسر علی احمد فاطمی، ماہنامہ نیا دور

لکھنؤ، جون ۲۰۰۰ء، ص:۶)

عام طور سے تحقیق کاموں میں مواد کی فراہمی کا سہرا محققین اپنے سر باندھتے ہیں اور حوالہ بطور اگر ایک کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو کتابیات کے تحت ایسی دس بیس کتابوں کا اندراج کرتے ہیں جن کو انہوں نے چھوا تک نہ ہو۔ یہ ایک غلط رجحان ہے اور سچائی اور تحقیق کے اصولوں کے منافی ہے۔ تحقیق میں، جیسے کہ پہلے لکھا گیا ایمانداری برتنا بنیادی شرط ہے۔ تحقیقی کاموں میں مبالغہ آرائی، بے جا تعریف، تصنع، بناوٹ، طنز و تشنیع اور غیر ضروری باتوں سے گریز کرنا چاہئے۔ اسلوب نگارش عام فہم، عالمانہ، صاف ستھرا، سادہ سلیس اور چاشنی سے لبریز ہو اور قاری بلکہ ریسرچ اسکالر کو مستفید کرنے والا ہے۔ بامحاورہ زبان استعمال کرنا تحقیق کے لیے ضروری نہیں۔

اسلوب ایسا ہو جس سے قاری کسی جگہ بھی اکتاہٹ یا گھبراہٹ محسوس نہ کرے۔ بھاری بھرکم، ادق، ناقابل فہم اور پُرتکلف الفاظ استعمال کرکے قاری اور محققین پر بے وجہ اپنی بزرگی، بڑائی اور علمیت کا سکہ جمانے سے گریز کرنا چاہئے۔ تحقیق میں اپنے خیالات و نظریات کو تھوپنے سے بھی گریز کرنا چاہئے، دوسرے نظریات سے بحث بھی اس میں فضول ہے کیونکہ اس میں صرف حقائق کی نشاندہی ہونی چاہئے۔ تحقیق کیا ہے اور کیسی ہونی چاہئے اس بابت درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''تحقیق پوشیدہ چیزوں اور حقائق کی تلاش کا عمل ہے۔ لغت میں 'تحقیق' کے معنی چھان بین، کھوج، دریافت، تلاش، تفتیش وغیرہ ہیں۔ تحقیق کے لیے انگریزی لفظ research رائج ہے جس کے معنی توجہ اور جستجو سے تلاش کرنا یا دوبارہ تلاش کرنا، وغیرہ ہیں۔ اس کا ایک مفہوم، گھوم پھر کر تلاش کرنا بھی، بیان کیا جاتا ہے۔ ہندی میں اس کے لیے ایک مناسب لفظ 'شودھ' استعمال کیا جاتا ہے، جس کا مادہ 'شدھ' ہے اور جس کا مطلب ہے کسی چیز کو صاف کرنا اور اس کا میل وغیرہ دور کرکے اسے سونے کی طرح کندن بنا دینا۔

اردو اصطلاح میں تحقیق کا مطلب یا مقصد ادبی تحقیق سے لیا جاتا ہے اور اس کے لیے سارے جدید سائنسی یا سائنٹفک اصولوں، قاعدوں اور ضابطوں کو برتنا لازمی سمجھا جاتا ہے کیونکہ تحقیق کا بنیادی مقصد مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مواد کو تلاش کر کے پیش کر دینا ہی نہیں بلکہ ان حقائق کو سامنے لانا بھی ہے، جن پر کسی وجہ سے پردہ پڑا ہوا ہو۔

دنیا کی بیشتر ترقی یافتہ زبانوں میں تخلیقی اور تنقیدی ادب کے ساتھ تحقیقی کاموں کو بھی اہم مقام حاصل ہے اور برسوں سے تحقیق جس تیز رفتاری سے ترقی کی طرف گامزن ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عنقریب اردو کا دامن نہ صرف تحقیق کے گہر ہائے گراں مایہ سے بھر جائے گا بلکہ عالمی ادب کے تناظر اور تقابل میں بھی اس کو شاندار مقام حاصل ہوگا۔۔۔۔۔ تحقیقی کام جہاں محنت طلب اور بہت زیادہ مشکلوں بھرا ہے وہیں اس میں صبر، استقامت، مستقل مزاجی اور ہمت کی بھی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ شدید قوت ارادی کے بغیر یہ کام کسی طرح بھی انجام نہیں دیا جا سکتا۔''

(مقدمہ: ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی، اشاریہ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، مرتب: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں، ناشر: رامپور رضا لائبریری، مطبوعہ: ۲۰۰۹ء، ص: ۷)

تحقیق کے لیے حاصل شدہ مواد کا تجزیہ کرنا ایک نہایت پیچیدہ اور دشوار گزار عمل ہوتا ہے لیکن اس کے بغیر تحقیق کا حق پوری طرح ادا نہیں کیا جا سکتا۔ کسی ایک موضوع کی تحقیق کے لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ مختلف ادیبوں کی لکھی ہوئی کتابوں سے رجوع کیا جائے۔ ان سے مواد حاصل کر کے تحریروں کو اختصار کے ساتھ پیش کرنا چاہئے اور جو تحریر غالب گمان کی حیثیت رکھتی ہو اسی کو اولیت اور ترجیح دی جانی چاہیے لیکن اس میں اپنی آخری اور حتمی رائے یا تحقیق پیش کرنے سے پہلے سبھی تحریروں کا بہترین طریقے سے موازنہ کر لینا چاہئے۔

مواد میں دی گئیں معلومات میں اکثر و بیشتر خاصا تضاد پایا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں ان محققین کے پیش کردہ بنیادی مآخذات سے رجوع کرنا چاہئے اور

بہت دھیان سے اس کو لکھنا چاہیے۔کوشش یہ کرنی چاہیے کہ ہر صورت میں اولین اور بنیادی مآخذ کو ترجیح دی جائے اور اس کو پیش کیا جائے۔اردو کے نامور محقق رشید حسن خاں ثانوی مآخذ اور حوالے کو قبول کرنے کے سخت خلاف تھے اور اس کو مسترد کر دیا کرتے تھے۔ان کے نزدیک پہلا اور بنیادی مآخذ ہی درست اور قابل قبول ہوتا ہے۔

مواد کی ترتیب وتدوین میں بھی محقق کو بہت زیرکی اور ہوشیاری کا استعمال کرنا چاہئے۔مواد کو پیش کرنے کی ترتیب جو بھی بڑے محققین نے پیش کی ہے اسی کے تناظر میں اور ان کے اصولوں کے مطابق اس مواد کو ترتیب کے ساتھ پیش کرنا چاہئے۔حسن ترتیب ہی تحقیق کا کسی حد تک حق ادا کر سکتا ہے۔مواد کی فراہمی کے تعلق سے پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

''کسی زبان کے ادب کا جتنا مواد موجود ہے اس سے کہیں زیادہ ضائع ہو چکا ہے۔کسی ادیب کی جملہ نگارشات موجود نہیں ہیں۔غالب روزانہ کسی کاغذ پر کچھ نہ کچھ لکھتے ہوں گے۔ان میں سے کتنی چیزیں محفوظ ہیں؟ بڑے شعرا اور نثر نگاروں نے اپنی تخلیقات کو ایک بار یا کئی بار ہاتھ سے لکھا ہوگا تب طباعت کے لیے دیا ہوگا۔کس کس کے پہلے، دوسرے اور آخری مسودے محفوظ ہیں۔سترہویں اٹھارہویں صدی میں اردو کے کتنے زیادہ شعرا رہے ہوں گے۔ان میں سے معدودے چند ہی کی تخلیقات باقی ہیں۔میری طرح ہر اہل قلم تصور کر سکتا ہے کہ اس نے اپنی حیات رفتہ میں کتنے اوراق سیاہ کیے ہوں گے، کتنے خطوط لکھے ہوں گے، کتنے نوٹ لیے ہوں گے، ان میں سے اب کتنے محفوظ رہے ہیں۔'' (کتاب: تحقیق کا فن، پروفیسر گیان چند جین، مطبوعہ :۱۹۹۰، ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ص:۱۴۰)

اردو کا بہت سا مواد کتابوں اور رسالوں میں بکھرا ہوا ہوتا ہے۔اس کی تلاش کا سب سے اہم اور مؤثر ذریعہ اشاریہ ہوتا ہے لیکن اس ضمن میں بہت کم کام ہوا ہے۔اشاریہ سازی جتنا اہم کام ہے اسی قدر یہ مشکل بھی ہے اس لیے اس طرف توجہ کم دی جاتی ہے۔یونی

ورسٹیوں میں پروفیسرز اس طرف توجہ نہیں دیتے اور طلبا اس مشکل کام کو ہاتھ لگانا نہیں چاہتے۔ بہرحال مواد کی فراہمی کیسے ہو اس سلسلے میں پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے اپنے موضوع سے متعلق سب سے اچھی کتاب کو دیکھئے یعنی ایسی کتاب کو جس میں سب سے زیادہ مواد متوقع ہے۔ پرانی کتاب پر نئی کتاب کو اولیت دیجیے کیونکہ نئی کتاب میں پیشتر کی کتاب کی تحقیق بھی شامل کر لی گئی ہوگی۔ اس کے بعد کم اہم کتابیں دیکھ جایئے۔ جس طرح الجھی ہوئی ڈور کی لڑی کی ایک گرہ کے بعد دوسری گرہ کھلتی جاتی ہے اسی طرح ہر کتاب کے حوالوں اور کتابیات سے مزید مآخذ کی نشاندہی ہوتی جائے گی اور کتابوں اور رسالوں کی کڑی سے کڑی مل جائے گی۔ یہ جان کر آگے بڑھیے کہ ہر موضوع سے متعلق کافی مواد موجود ہے، اسے تلاش کرنا ہے کیونکہ بعض موضوعات کا مواد کافی پرانے رسالوں اور غیر متوقع کتب خانوں میں مدفون ہے، وہاں تک پہنچنا ہے۔'' (کتاب: تحقیق کا فن، پروفیسر گیان چند جین، مطبوعہ: ۱۹۹۰، ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ص: ۱۶۹)

تحقیقی مواد کی فراہمی کے بعد، مواد کی جانچ پرکھ کرنا، اس کی تسوید کرنا، اس کا تجزیہ کرنا وغیرہ ضروری ہے لیکن اس تجزیہ کو تحقیق کے اصولوں کے مطابق ہی کرنا چاہیے تبھی کسی ریسرچ اسکالر کو اچھی اور مکمل کامیابی مل سکے گی۔ اس ضمن میں پروفیسر گیان چند جین نے اسکالرز کے لیے بہت مفید مشورے دیئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہر تحقیق سے پہلے کچھ تحقیق موجود ہوتی ہے۔ بعد کے تحقیق کار کو ماضی کی تحقیق یعنی پہلے سے موجود مواد کو پرکھنا، پھٹکنا، چھاننا ہوتا ہے۔ مواد کی فراہمی اور تسوید کے درمیان کی منزل ہے مواد کا جائزہ لینا، پایۂ اعتبار متعین کرنا اور تصحیح کرنا، یہی تحقیق کا مرکزی کام ہے۔ تحقیق کار کا علمی سرمایہ جتنا کثیر اور اس کی نظر جتنی تیز و عمیق ہوتی ہے اسی اعتبار سے وہ اپنے حاصل مطالعہ کا بہتر تجزیہ و قدر پیمائی کر سکتا ہے۔ ماضی کے لیے جو اصول بنائے گئے تھے وہ تحقیقی صحت طے کرنے کے لیے بھی مثالی کسوٹی مانے جا سکتے

ہیں۔'' (کتاب: تحقیق کا فن، پروفیسر گیان چند جین، مطبوعہ: ۱۹۹۰، ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ص: ۱۹۴)

اس صوت حال میں تحقیقی مواد کا جتنا اچھا اور کارآمد تجزیہ کیا جا سکے گا اسی کے مطابق تحقیق نکھر کر سامنے آئے گی۔ تحقیق کیا ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں، اس بابت ڈاکٹر تلک سنگھ لکھتے ہیں:

''تحقیق علم کا وہ شعبہ ہے جس میں منظم لائحہ عمل کے تحت سائنسی اسلوب میں نامعلوم و ناموجود حقائق کی کھوج اور معلوم و موجود حقائق کی نئی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ علم کے علاقے کی توسیع ہوتی ہے۔''

(ڈاکٹر تلک سنگھ نوین شودھ وگیان، پرکاش سنستھان دہلی، مطبوعہ: ۱۹۸۳، ص: ۲۰)

اس سلسلے میں گیان چند جین کے نظریات سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ریسرچ کی ماہیت، اس کا اسلوب، اس کا مقصد اور اس کی کیوں ضرورت ہے اس بابت بہت واضح الفاظ میں لکھا ہے، وہ کہتے ہیں:

''ریسرچ ایک حقیقت پنہاں یا حقیقت مبہم کو افشا کرنے کا باضابطہ عمل ہے اور اسی تعریف سے تحقیق کا مقصد بھی صاف ہو جاتا ہے 'نامعلوم یا کم معلوم کو جاننا' یعنی جو حقائق ہماری نظروں کے سامنے نہیں ہیں انہیں کھوجنا۔ جو سامنے تو ہیں لیکن دھندلے ہیں ان کی دھند دور کر کے انہیں آئینہ کر دینا۔ انسان کو ہمیشہ نامعلوم کو جاننے کی گدّ رہتی ہے۔ معلوم کرنے میں دوسرے فوائد سے قطع نظر ایک ذہنی حظ اور طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ جہاں تک اردو کی ادبی تحقیق کا تعلق ہے اس کا بھی یہی مقصد ہے کہ جن مصنفین، جن ادوار، جن علاقوں، جن کتابوں اور متفرق تخلیق کار کے بارے میں کم معلوم ہے اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی جائیں۔ ان کے بارے میں اب تک جو کچھ معلوم ہے اس کی جانچ پڑتال کر کے اس کی غلط بیانیوں کی تصحیح کر دی جائے تا کہ غلط مواد کی بنا پر غلط فیصلے صادر نہ کر دیئے جائیں۔'' (کتاب: تحقیق کا فن، پروفیسر گیان

چند جین، مطبوعہ: ۱۹۹۰، ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ص: ۷)

دوسری زبانوں میں محققین کی مدد کے لیے ہر قسم کے حوالے کی کتابیں ملتی ہیں۔ اردو میں ان کی سخت ضرورت ہے۔ ان میں بیشتر کام ایک فرد کے بجائے گروہی پروجکٹ کے ذریعہ بہتر طریقے سے سرانجام ہو سکتے ہیں۔ سب سے پہلا کام مخطوطات کی وضاحتی فہرست ہے۔ فی الوقت حالت یہ ہے کہ ملک کے بڑے بڑے کتب خانوں کی بھی معتبر اور آج تک کے مدخولہ مخطوطات کی فہرستیں موجود نہیں۔ اگر مشاق محققین اپنے شہر کے مخطوطات کی ہی فہرست بنا دیں تو بڑی خدمت ہو۔

دوسرا حوالہ جاتی کام ہر بڑے ادیب کا اشاریہ ہے جس میں ادیب کی جملہ تخلیقات کی جامع فہرست بھی ہو اور اس ادیب پر شائع شدہ کتابوں اور مضامین کی فہرست بھی۔ اس طرح ہر صنف اور رسال کا اشاریہ ہونا چاہیے۔ اس طرح رسالوں کا مجموعی اشاریہ بہت مفید ہوگا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے لکھتے ہوئے تحقیقی مقالوں اور خاص کر غیر مطبوعہ مقالوں کا وضاحتی اشاریہ بن سکے تو یہ اسکالرز کے لیے اور بھی مفید ہوگا۔ ان امور کی طرف خاص توجہ اور دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

تحقیقی کاموں میں اس بات کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ تحقیق کے لیے کیسے موضوع کا انتخاب کیا جائے۔ اس میں کافی غور و خوض کرنا چاہئے کیونکہ ایک بات موضوع منتخب ہو جائے تو اس میں ترمیم و تنسیخ دشوار ہو جاتی ہے۔ جتنا ممکن ہو غور و خوض کرنا چاہئے لیکن یہ ضروری ہے کہ جب موضوع طے یا مقرر ہو جائے اور اس پر ذہن اور دل مائل اور ملتفت ہو جائے تو اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے اور جی جان سے اس کی تحقیق میں لگ جانا چاہئے۔ اس سلسلے میں پرفیسر گیان چند جین کے خیالات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''تحقیق میں سب سے اہم منزل اور مرکزی نقطہ موضوع کا انتخاب ہے۔ رسالے کے مضمون کے لیے موضوع مختلف سطح کا ہوگا اور تحقیقی مقالے کے لیے

مختلف۔ہمیں یہاں آخرالذکر ہی سے سروکار ہے۔نئے ریسرچ اسکالر کے مقالے کے لیے موضوع کا معیار مختلف ہوگا اور مشاق محققوں کے لیے مختلف۔نیا تحقیق کار اور پختہ تحقیق کار محقق دونوں اپنی ذہنی صلاحیت اور وسائل کے اعتبار سے موضوع چنیں گے۔میرا خیال ہے کہ محقق کسی ڈگری کی خواہش یا رسالے کے مدیر یا کسی مجموعے کی مرتب کی فرمائش سے مجبور نہ ہو اور آزادی کے ساتھ اپنا موضوع تلاش کر سکے تو یہ کام مشکل نہیں ہونا چاہئے۔جہاں دوسرے کا دخل درمیان میں آجاتا ہے وہاں دقت سر اٹھاتی ہے۔سندی مقالے کے لیے موضوع تلاش کرنا انہیں اسباب سے ٹیڑھی کھیر بن جاتا ہے۔'' (کتاب:تحقیق کا فن، پروفیسر گیان چند جین، مطبوعہ:۱۹۹۰، ناشر:اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ص:۶۸)

مختصر یہ کہ اردو میں تحقیق ایک اہم اور مفید کام ہے اس سے تخلیق وتنقید کے ساتھ تحقیق کی بھی نئی راہیں کھلتی ہیں۔اصناف ادب میں اضافہ ہوتا ہے۔مواد کی رسائی اور مواد کی فراہمی میں نئے اسکالرز کو سہولیات حاصل ہوتی ہیں۔اس صبر آزما کام میں اسکالرز کا بنیادی مقصد یہ جذبہ ہو کہ قارئین اور خاص کر ادب کے طالب علموں اور ان میں بھی جو تحقیق وتنقید کے جویا ہوں ان تک درست اور سہی مواد بآسانی پہنچ سکے۔تحقیقی عمل کتنا بھی پیچیدہ ہو اس میں کتنی بھی دشواریاں اور پریشانیاں ہوں لیکن بہر حال اس سے دوسروں کو مستفید ہونے کا موقع ملتا ہے۔اسکالر یا محقق کا مقصد ڈگری کا حصول یا نوکری کی تلاش نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ یہ مقصد بنیادی نہیں بلکہ ثانوی حیثیت رکھنا چاہیے۔

اسکالر کو اپنے کام میں پوری طرح مخلص ہونا چاہیے، اسے محنت سے کسی طور بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔تحقیقی کاموں میں اگر چہ مصارف بھی بہت ہوتے ہیں لیکن اس کے برعکس آج طلبا یا اسکالرز کو جو سہولیات حاصل ہیں ان کا تصور بھی پہلے محال تھا۔ان سہولیات سے پوری طرح مستفید ہو کر اپنے کام کو لگن اور شوق اور محنت سے تحقیقی کام کو مکمل کرنا چاہیے اور بنیادی مقصد ادب اور زبان کی خدمت ہی ہو تو کامیابی یقینی طور پر

ملے گی۔ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر احتشام حسین نے اردو تحقیق کے سلسلے میں جو مشورے دیئے ہیں ان کو بھی یہاں درج کر دیا جائے، موصوف لکھتے ہیں:

۱۔ اگر چہ متنی تنقید کی طرف توجہ کی جارہی ہے لیکن بہت سے اہم شعرا اور ادیبوں کے کارنامے یوں ہی پڑے ہیں۔

۲۔ متنی تنقید کے علاوہ تحقیق کے دوسرے پہلوؤں مثلاً حوالہ جات اور کتابیات کی تیاری بھی ضروری ہے۔

۳۔ تحقیقی کاموں میں ادبی حسن بھی ملحوظ رکھنا مفید ہوگا۔

۴۔ تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کو لسانیات، تاریخ، لغت، سماجی علوم، معنی و بیان، ادبی اور شعری روایات کے ارتقا کا علم بھی ہو۔

۵۔ اس وقت تک جو کام ہوا ہے وہ قابل قدر سہی لیکن اس کا بہت سا حصہ نہ تو معیاری ہے اور نہ تاریخ ادب میں اضافہ کرتا ہے۔ ضروری اور غیر ضروری، اہم اور غیر اہم میں تمیز کرنا بھی ضروری ہے۔

۶۔ تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں، اس لیے اس وقت تک زبان و ادب کے سلسلے میں جو علمی کام ہوئے ہیں انہیں نئے کام کے لیے مواد ہی سمجھنا چاہیے۔

۷۔ ہمارے اچھے محققوں کو تحقیق کے طریق کار پر بھی اظہار خیال کرنا چاہئے اور اپنے تجربوں سے نئے محققوں کو واقف کر کے ان کی راہ آسان بنانا چاہیے۔

۸۔ یونی ورسٹیوں میں جو مقالے لکھے جاتے ہیں ان کے معیار کی طرف اور زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ (مضمون: اردو میں تحقیق آزادی کے بعد، پروفیسر احتشام حسین، نصف صدی نمبر، ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، مارچ۔مئی ۱۹۹۵، ص: ۱۹۳)

☆☆☆

Faiz Ahmad Faiz ki Shairi mein Inqlabi Rujhaan by Nusrat Shaheen

(Lecturer, dept. of Urdu, Matiaburj college,Kolkata) cell-7003786650

نصرت شاہین (لکچرار، شعبہء اردو، مٹیا برج کالج، کولکاتا)

فیض احمد فیض کی شاعری میں انقلابی رجحان

Abstract:

This article explores the revolutionary tendency in the poetry of Faiz Ahmed Faiz. His work reflects themes of resistance, social justice, and human 'struggle, influenced by the Progressive Writers Movement. Through selected examples, the study highlights how Faiz's poetry expresses a strong inclination toward change and challenges oppressive systems. It concludes that his poetic vision remains relevant and inspiring in contemporary times.

یہ مضمون فیض احمد فیض کی شاعری میں انقلابی رجحان کا مختصر جائزہ پیش کرتا ہے۔ان کے کلام میں مزاحمت، سماجی انصاف اور انسانی جدوجہد کے عناصر نمایاں ہیں، جو ترقی پسند تحریک سے متاثر ہیں۔منتخب مثالوں کے ذریعے یہ واضح کیا گیا ہے کہ فیض کی

شاعری تبدیلی اور انصاف کی ایک مضبوط آواز ہے۔ آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ان کا پیغام آج بھی مؤثر اور بامعنی ہے۔

Keywords:

Revolutionary tendency, resistance, Urdu poetry, social justice, progressive thought, Faiz Ahmed Faiz.

اردو ادب میں فیض احمد فیض کا نام ایک ایسے شاعر کے طور پر نمایاں ہے جنہوں نے شاعری کو محض جذباتی اظہار تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے سماجی اور سیاسی شعور کی مؤثر ترجمانی کا ذریعہ بنایا۔ ان کا کلام ایک ایسی فکری جہت کا حامل ہے جس میں فرد کے ذاتی احساسات کے ساتھ ساتھ اجتماعی مسائل، ناانصافی اور جبر کے خلاف ایک واضح ردِعمل بھی شامل ہے۔ فیض کا تعلق اس ادبی روایت سے ہے جس نے ادب کو معاشرتی تبدیلی کا وسیلہ سمجھا۔ ترقی پسند تحریک کے اثرات نے ان کی شاعری کو ایک خاص سمت عطا کی، جہاں محبت، امید اور مزاحمت ایک دوسرے میں گھل مل کر ایک نیا اسلوب تشکیل دیتے ہیں۔ ان کے ہاں انقلاب کا تصور محض سیاسی تبدیلی تک محدود نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر انسانی وسماجی شعور کی عکاسی کرتا ہے. فیض کی شاعری میں انقلابی فکر ایک مستقل اور نمایاں فکری جہت کے طور پر سامنے آتی ہے، جو ان کے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ان کے کلام میں یہ رجحان کسی وقتی ردِعمل کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک پختہ نظریاتی وابستگی کی عکاسی کرتا ہے، جس کے ذریعے وہ انسانی آزادی، مساوات اور انصاف جیسے بنیادی اقدار کو اجاگر کرتے ہیں۔

فیض احمد فیض کے انقلابی رجحان کو سمجھنے کے لیے ان کے اپنے خیالات نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک انٹرویو، جس کا عنوان "فیض احمد فیض سے ایک انٹرویو" ہے اور جو رسالہ شبستاں کے مدیر کے ساتھ کیا گیا، وصی احمد سندیلوی کی کتاب "فیض احمد فیض: انقلابی شاعر" میں شامل ہے۔ اس انٹرویو میں فیض نے اپنی شاعری کی

مقصدیت اوراس کے پیغام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

" پیغام تو وہی ہے جو ہر شعر کے اندر ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ دنیا میں جتنا دکھ کم ہو سکے اچھا ہے۔ ہمیں انسانوں کی خوشیوں میں اضافہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے یہی میری شاعری کا پیغام ہے۔"

(فیض احمد فیض، انقلابی شاعر" وصی احمد سندیلوی،",1977 فیض احمد فیض سے ایڈیٹر شبستاں کا ایک انٹرویو"،ص،104)

یہ بیان اس بات کو واضح کرتا ہے کہ فیض کے نزدیک شاعری کا مقصد محض جمالیاتی لطف فراہم کرنا نہیں بلکہ انسانی زندگی میں بہتری اور خوشحالی کا فروغ دینا بھی ہے۔ وہ اپنے کلام کے ذریعے دنیا میں موجود دکھ اور محرومی کو کم کرنے اور انسانیت کی فلاح کے لیے ایک مثبت کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ یہی فکر ان کی شاعری میں انقلابی رجحان کی بنیاد فراہم کرتی ہے، جہاں وہ صرف مسائل کی نشاندہی نہیں کرتے بلکہ ایک ایسے معاشرے کا تصور بھی پیش کرتے ہیں جس میں انسانوں کی خوشیوں میں اضافہ ہو اور ناانصافی کا خاتمہ ممکن ہو سکے۔

فیض کی ابتدائی شاعری میں رومانویت کا ایک لطیف رنگ نمایاں ہے، تاہم یہ جلد ہی فرد کی داخلی کیفیت سے نکل کر اجتماعی انسانی تجربے سے جڑ جاتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے اثرات کے تحت یہ رجحان مزید وسعت اختیار کرتا ہے، جہاں ذاتی احساسات سماجی شعور میں ڈھل جاتے ہیں۔ نتیجتاً فیض کی شاعری میں انقلابی رجحان ابھرتا ہے، جو ان کے عہد کے مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے ناانصافی کے خلاف ایک مؤثر اور بامعنی آواز بن جاتا ہے۔

اسی تدریجی تبدیلی کے نتیجے میں فیض کی شاعری میں فکری جہت واضح طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے، جو ان کے عہد کی سماجی ناانصافی کے خلاف ایک پراثر ترجمانی بن جاتا ہے۔ اس کا نمایاں اظہار ان کی نظم" بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" میں نظر آتا ہے،

جہاں وہ کہتے ہیں:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے

یہی فکر آگے چل کر ایک وسیع تر مشترکہ شعور کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جہاں فرد کی آواز محض ذاتی اظہار نہیں رہتی بلکہ ایک اجتماعی امید اور تبدیلی کی علامت بن جاتی ہے۔

اسی تسلسل میں فیض اپنے کلام میں ایک ایسے مستقبل کا تصور پیش کرتے ہیں جو ناانصافی کیخاتمے اور انصاف کے قیام سے عبارت ہے۔ جیسا کہ وہ اپنی نظم "ہم دیکھیں گے" میں فرماتے ہیں۔

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے

یہ نظم ایک ایسے مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہے جہاں ظالمانہ رویوں کا نظام ختم ہوتا ہے، حق اور سچائی غالب آتی ہے۔ یہ نظم علامتی اور فکری انداز میں ظلم و جبر کے خاتمے اور ایک منصفانہ نظام کے قیام کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ فیض نے ان پیکروں کے ذریعے ایک ایسے انقلابی تصور کو پیش کیا ہے جس میں باطل قوتیں زوال پذیر ہوتی ہیں اور حق و انصاف کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔

اسی فکری اور انقلابی میلان کا اظہار فیض احمد فیض کی غزلوں میں بھی نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتا ہے، جہاں وہ روایتی عشقیہ پیرایے کو وسعت دیتے ہوئے اسے اجتماعی درد

اور سماجی حقیقتوں سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

یہاں قلم اور تحریر کو ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنے کے ایک اہم وسیلے کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو ان کے انقلابی رجحان کی واضح نمائندگی کرتا ہے۔ فیض کی شاعری میں استقامت اور حوصلے کا پہلو بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے، جہاں وہ ہر قسم کی محرومی کے باوجود جدوجہد جاری رکھنے کا درس دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے"

اس شعر میں فیض جبر کے باوجود اظہار کی قوت کو اجاگر کرتے ہیں۔ قلم اور لکھنے کے وسائل چھین بھی لیے جائیں تو شاعر اپنے خونِ دل کو سیاہی بنا کر حق بات کہنا جاری رکھتا ہے۔ فیض کی غزلوں میں ظلم کے خلاف بغاوت اور مزاحمت کا پہلو نہایت مؤثر اور اچھوتے انداز میں سامنے آتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

"اے ظلم کے ماتو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے"

فیض احمد فیض اس شعر میں مظلوموں کو خاموشی توڑنے اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ شاعر کے نزدیک مسلسل صبر اور خاموشی کے بجائے صدائے احتجاج ہی وہ راستہ ہے جو بالآخر جبر کے خاتمے کا سبب بنتا ہے۔ یہ شعر بیداری، جرات اور اجتماعی جدوجہد کی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔

فیض کی شاعری میں امید اور انتظار کا ایک گہرا احساس بھی موجود ہے، جو ان کے انقلابی رجحان کو ایک انسانی اور فکری وسعت عطا کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر

وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

اسی تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فیض کے یہاں انقلابی میلان محض احتجاج تک محدود نہیں بلکہ امید، جدوجہد اور مسلسل انتظار کا ایک مربوط اظہار ہے، جو ہر دور میں اپنی معنویت برقرار رکھتا ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ فیض احمد فیض کی شاعری محض الفاظ کا حسن نہیں بلکہ ایک زندہ فکری روایت کی ترجمان ہے، جس میں استقامت، امید اور انسانی وقار ایک دوسرے سے پیوست نظر آتے ہیں۔ ان کی انقلابی فکر وقتی ہیجان نہیں بلکہ ایک دیرپا شعوری وابستگی کا مظہر ہے، جو ہر عہد میں نئے معنی اور نئی جہتوں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو فیض کے کلام کو محض اپنے زمانے تک محدود نہیں رہنے دیتی بلکہ اسے ایک آفاقی اور لازوال ادبی حیثیت عطا کرتی ہے۔

حوالہ جات:

1۔ کلیات فیض، فیض احمد فیض۔
2۔ فیض احمد فیض: انقلابی شاعر" وصی احمد سید یلوی 1977
3۔ فیض احمد فیض، عکس اور جہتیں" مرتبہ، شاہد ماہلی، 1987

☆☆☆

Zaban sikhne mein zehni Nuqoosh ka Istemal by Dr. Nida Shahab (Asst. Prof. MANUU CTE Asansol) cell-9718065136

ڈاکٹر ندا شہاب (اسسٹنٹ پروفیسر، مانو سی۔ٹی۔ای، آسنسول)

زبان سیکھنے میں ذہنی نقوش کا استعمال

تعارف: ذہنی نقوش یا مائنڈ میپ ایک ایسا بصری آلہ ہے جس کا استعمال انفارمیشن مینجمنٹ ٹول کے طور پر کیا جاتا ہے۔ جو انتہائی دلچسپ اور جامع طریقے سے ہماری معلومات کی تشکیل یعنی Structure، ترتیب، حفظ، منصوبہ بندی اور ذہن سازی جیسے عوامل میں مدد کرتا ہے۔ مائنڈ میپنگ نے ابتدائی دنوں سے لے کر اب تک ایک لمبا فاصلہ طے کیا ہے جب ٹونی بزان (Tony Buzan) نے اسے پہلی بار دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ حالانکہ اب یہ مرکزی دھارے میں شامل ہو چکا ہے اور ماہرین تعلیم، طلباء، پیشہ ور افراد اور دیگر مختلف افراد کو امداد فراہم کرتا ہے۔ تاکہ وہ منظم انداز میں معلومات کے نظم و نسق اور جدید انداز میں معلومات کے تصور کو پیش کرتے ہوئے کامیابیاں حاصل کرتے رہیں۔ ذہنی نقوش کا استعمال کر کے دماغ کے دونوں حصوں کو بہتر ڈھنگ سے ملوث کیا جا سکتا ہے اور کسی بھی تصور کو دماغ میں ایک مضبوط مقام عطا کیا جا سکتا ہے اس لیے ذہنی نقوش کا استعمال مختلف مضامین میں کیا جاتا ہے۔

زبان انسانی زندگی کا لازمی جز ہے جسے انسان پیدائش کے بعد ہی سے سیکھنا شروع کر دیتا ہے اور جس کے بغیر کوئی شخص اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بچے کی

ابتدائی زندگی ہی سے شروع ہوا یہ مشغلہ تا عمر چلتا ہے۔ زبان سیکھنے کے حوالے سے ذہنی نقوش سے متعلق یہ سوال اکثر سامنے آتا ہے کہ کس طرح ذہنی نقوش کا استعمال زبان سیکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے اور ہم کس طرح اس کا استعمال کر بچوں کے لیے زبان سیکھنا سہل بنا سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ زندگی کے مختلف شعبوں کا حصہ بنتا جا رہا ہے مثلاً منصوبوں کا انعقاد اور انتظام کرنا، جلسوں، نیٹ ورکنگ ایونٹس، انٹرویوز، ریسرچ ڈویلپمنٹ وغیرہ۔ یہ کاروبار، خرید و فروخت اور مارکیٹنگ کی حکمت عملی کی منصوبہ بندی میں بھی مدد کرتا ہے۔

دماغی نقشہ متعدد کاموں کو آسان بنانے میں ایک اچھا ذریعہ ہے جیسے یہ وقت پر کام کرنے میں، مالی منصوبہ بندی، پروگراموں کو سرانجام دینے، اہداف کا تعین، تعطیلات اور خریداری کے لئے منصوبہ بندی، اور اہم معلومات، واقعات اور تاریخوں کو یاد رکھنے میں مدد کرتا ہے اور ان تمام مسائل کو حل کرنے کے لئے مائنڈ میپنگ کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ انسانی دماغ کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے: دائیں اور بائیں، جو ایک دوسرے سے آزادانہ طور پر کام کرتے ہیں۔ دائیں طرف کا حصہ تخیل، تخلیقی صلاحیتیں اور تصاویر دیکھنے کے ساتھ وابستہ ہے جب کہ بائیں طرف کا حصہ وجوہات، زبان، ترتیب اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات دیکھنے کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ بہتر اور متوازن آموزش کے لیے دماغ کے دونوں حصوں یعنی بائیں اور دائیں حصہ کے مابین تال میل کو بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

تعریف: ذہنی نقوش کی تعریف مندرجہ ذیل ہے۔

ذہنی نقوش خطی سوچ (Linear thinking) کا دماغی متبادل ہے۔ جو خیالات کو ہر سمت میں پھیلانے اور مختلف زاویوں سے سمجھنے کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔ (T.Buzan بوزان)۔

دماغی نقشہ اپنے دماغ میں معلومات کو محفوظ کرنے یا بآسانی یاد کرنے کا ایک تخلیقی اور موثر

طریقہ ہے۔ یہ نوٹس لکھنے کے لیے ایک تخلیقی اور موثر ذریعہ بھی ہے جو لغوی معنی میں آپ کے خیالات کو نقشہ جات' میں تبدیل کر دیتا ہے اور یہ بہت آسان بھی ہے (بوزان)۔

دماغی نقشہ دراصل سوچ کے عمل کی ایک بصری نمائندگی یا بصری شبیہ ہے اور خطی علامت نویسی کے تخلیقی اور موثر متبادل کی حیثیت سے فوری طور پر مقبول ہو گیا۔ دماغی نقشہ کسی بھی طرح کی منصوبہ بندی (planning)، تنظیم سازی (organize)، تخلیق (creating)، پیش کرنے (presentation)، مسئلہ حل (problem solving) کرنے، رابطہ (communicate) قائم کرنے اور مزید کام سرانجام دینے کے لیے قابل عمل آلہ ہے۔

دماغی نقشہ سازی کے متعدد فوائد ہیں:

☆ کسی مخصوص صورتحال میں عقلی اور منطقی سوچ کو فروغ دیتا ہے۔

☆ دماغ کے دونوں حصوں کو فعال بناتا ہے۔

☆ کسی موضوع کے وسیع جائزہ کو سمجھنے، تصویری شکل دینے اور تصور کرنے میں مدد کرتا ہے۔

☆ تفصیلی معلومات کو دریافت کرنے کی صلاحیت کو بہتر بناتا ہے۔

☆ توجہ، ارتکاز، یادداشت اور فہم کو بہتر بنانے میں معاون ہے۔

☆ معلومات کو چھوٹے حصوں میں منظم کرنے میں مدد کرتا ہے، جو با آسانی حفظ اور باز یافت ہو سکتی ہیں۔

☆ معلومات (information) کے زیادہ بوجھ سے نمٹنے میں مدد کرتا ہے۔

☆ تخیل اور تخلیقی صلاحیت کو ابھارتا ہے۔

☆ معلومات کو حاصل کرنے اور منظم کرنے کو تفریحی اور دلچسپ بناتا ہے، جو بعد میں اس موضوع میں آپ کی دلچسپی کو مستحکم کرتا ہے۔

☆ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت کو تیز کرنے میں مدد کرتا ہے۔

☆ تعلیمی کام کا بوجھ سنبھالنے کی صلاحیت کو بہتر بناتا ہے۔
☆ غیر معمولی تخلیقی بصیرت اور نظریات کے قفل کھولنے میں مدد کرتا ہے۔
☆ کام کرتے ہوئے، مطالعہ کرتے وقت یا سیکھنے میں وقت کی بچت میں مدد کرتا ہے۔
☆ ٹیسٹ اور امتحانات کی تیاری آسان بناتا ہے۔
☆ بظاہر غیر متعلق معلومات کے چھوٹے چھوٹے ٹکروں کے مابین تخلیقی تعلق قائم کرتا ہے۔
☆ مکمل تصویر دیکھنے میں مدد کرتا ہے۔

دماغی نقشہ کی خصوصیات:

تمام دماغی نقشوں میں کچھ چیزیں مشترکہ ہیں۔ یہ ایک قدرتی ڈھانچہ ہے جس کے ذریعہ مختلف تصورات کو نظم کیا جا سکتا ہے۔ یہ مرکز سے شروع ہوتا ہے اور لائنوں، علامتوں، الفاظ، رنگ اور تصاویر کی مدد سے دماغ کے تصورات کو سہل اور مناسب انداز میں پیش کرتا ہے اور سمجھنے میں بھی مدد کرتا ہے۔ مائنڈ میپنگ ایک اسلوب معلومات کی ایک لمبی فہرست کو رنگین، یادگار اور انتہائی منظم ڈائیگرام میں تبدیل کر دیتی ہے جو دماغ کو اس کے فطری طریقے سے کام کرنے کی صلاحیت پر چلنے میں مدد گار رہے۔

☆ مرکزی تصویر میں مرکزی خیال یا موضوع کو واضح کیا جاتا ہے۔
☆ مرکزی تصویر سے مرکزی شاخیں (جڑتے ہوئے باہر کی طرف) نکلتی ہیں جو مرکزی شاخیں یا برانچس کہلاتی ہیں۔
☆ شاخوں پر اہم تصویر یا مطلوبہ لفظ لکھا یا چھپا ہوتا ہے۔
☆ کم اہمیت کے عنوانات متعلقہ شاخوں کے ذریعہ 'چھوٹی ٹہنیوں' کی حیثیت سے نمائندگی کرتے ہیں
☆ مختلف علامتیں اور تصاویر استعمال کی جاتی ہیں۔

☆ یہ عام طور پر رنگین ہوتا ہے لیکن سیاہ فانٹ رسمی طور پر ذہن کے نقشوں میں استعمال ہوتا ہے۔

☆ اس سے مل جل کر کام کرنے میں بھی حوصلہ ملتا ہے

دماغی نقشہ کس طرح کھینچیں: اب ہم دماغی نقشہ بنانے کی طرف بڑھیں گے۔ دماغی نقشہ کھینچنے کے لیے کچھ اقدامات پر عمل کرنا ضروری ہے:

پہلا مرحلہ۔ کاغذ کی ایک بڑی شیٹ لیں اور اسے افقی (Horizontal) طور پر اپنے سامنے رکھیں۔

مرحلہ دوم ۔ صفحے کے بیچ میں مناسب سائز کی تصویر بنائیں ۔ یہ مرکزی تصویر ہے جو دماغی نقشہ کے عنوان کی نمائندگی کرتی ہے، اس کے علاوہ ایک دائرہ کھینچ کر دائرہ کے اندر کچھ الفاظ لکھ کر بھی اس تصویر کی نمائندگی کی جاسکتی ہے۔

مرحلہ III ۔ مرکزی تصویر سے باہر کی طرف بناتے ہوئے کم از کم چار موٹی لچیلی شاخیں (کسی درخت کی شاخوں کی طرح شاخیں) بنائیں۔ ہر شاخ کے لئے مختلف رنگ کا استعمال بہتر رہے گا۔

چہارم مرحلہ۔ ان شاخوں کے ساتھ مطلوبا الفاظ (عنوانات) لکھیں جو مرکزی امیج اور دماغی نقشہ کے عنوان کی نمائندگی کرتے ہیں۔

مرحلہ V ۔ شاخوں سے جڑی ہوئی اضافی ٹہنیوں کو بنائیں۔ ان ٹہنیوں پر لکھے گئے الفاظ ذیلی عنوانات ہیں جو ان سے پہلے شاخوں پر لکھے گئے ہیں۔ مزید اضافی ذیلی عنوانات/مطلوبہ الفاظ اور ٹہنیوں کے ذریعہ اس کو مزید بڑھایا جاسکتا ہے۔

ذہنی/ دماغی نقشہ سازی کے لئے رہنما اصول:

دماغی نقشہ کھینچنے کے لیے چھ اصولوں پر عمل کیا جانا چاہیے۔ ذہنی نقشہ تیار کرنے کے لئے اہم اصول درجہ ذیل ہیں۔

1. وسط میں مرکزی تصویر بنائیں۔ یہ مناسب سائز اور رنگ کا ہونا بہتر ہے۔ جو طویل

عرصے تک یاد رہ سکے۔ مرکزی تصویر کے ساتھ ایک مرکزی لفظ بھی لکھا جا سکتا ہے۔ یہ بنانے والے پر منحصر ہے کہ وہ جس چیز کی پیروی کرنا چاہے کر سکتے ہیں جیسا کہ وہ صرف مرکزی تصویر کھینچ سکتے ہیں، بولڈ الفظ میں لکھ سکتے ہیں اور وہ مددگار لفظ کے ساتھ مرکزی تصویر کھینچ سکتے ہیں لیکن تمام الفاظ اور شبیہ رنگین ہوں سیاہ اور سفید نہیں۔

.2 موٹی شاخیں کھینچیں جو مرکزی شبیہ سے باہر کی طرف جاتی ہوئی ہوں۔

.3 شاخوں کو موٹا اور کم سے کم چار بنائیں۔ یہ شاخیں کسی بھی درخت کی شاخوں کی طرح لچیلی ہوں گی نا کہ سیدھی لائن۔

.4 تمام شاخوں کے لئے مختلف رنگ استعمال کریں۔

.5 اب مختلف رنگوں والے ذیلی عنوانات کے لیے ان مرکزی شاخوں سے مختلف ذیلی ٹہنیوں کو جوڑا جا سکتا ہے۔ ذہنی نقشے میں کم از کم چار رنگ استعمال کرنا پسندیدہ مانا جاتا ہے۔

.6 ہر لفظ کے نیچے بنائی گئی شاخ لفظ سے تھوڑی لمبی ہونی چاہئے۔

.7 شاخوں، ٹہنیوں اور مرکز میں استعمال ہونے والے الفاظ کو ان کی اہمیت کے اعتبار سے اہمیت دینے کیلئے لفظی درجہ بندی مختلف سائز میں کر سکتے ہیں۔

.8 ہر لفظ کی اہمیت پر زور دینے کے لئے (انگریزی میں) اپر اور لوئر کیس کا استعمال کریں۔ مثال کے طور پر، اعلی شاخوں پر بڑے اور چھوٹے الفاظ کو ٹہنیوں پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ صرف اپر کیس کے استعمال کو فونٹ کے سائز کی مدد سے الگ دیکھا یا جا سکتا ہے۔

.9 متن صرف ایک یا دو الفاظ میں ہونا چاہئے۔ شاخ/ٹہنی پر ایک لفظ لکھنا بہتر ہے۔ دو یا تین الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں لیکن ہر لفظ کے بعد ایک ہائفن (-) اور اس کے بعد دوسرا لفظ آئے گا جیسے کسی شاخ/ٹہنی پر (learning) لکھنے کے ساتھ (academic) لکھنا چاہتا ہے تو اسے (academic-learning) لکھا جائے گا۔

.10 یہ عام طور پر گھڑی کی سمت میں پڑھا یا بنایا جاتا ہے (م۔عبدالطیف خان)

رہنما اصولوں سے متعلق مزید مفید مشورے:

.1 نقشے میں مختلف علامات استعمال کی جاسکتی ہیں۔

.2 مخصوص خیالات کو اجاگر کرنے کے لئے شاخ کی موٹائی کا سہارا لیا جاسکتا ہے۔

.3 یاداشت اور یاد رکھنے کی اہلیت کو بہتر بنانے کیلئے تصویر، رنگ اور سائز کا مختلف کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

.4 مختلف قسم کے افکار اور نظریات کی درجہ بندی کرنے کے لئے علامتوں کا استعمال کریں۔

.5 اپنے خیالات کو الگ کرنے کے لئے عنوانات کے مابین مناسب وقفہ کا استعمال کریں۔

.6 پورے نقشہ ترغیب دینے والی تصاویر اور رنگوں کا استعمال کریں۔

.7 مخصوص شاخوں کی طرف توجہ مبذول کروانے کے لئے حدود اور سرحدیں بنائی جاسکتی ہیں۔

.8 لائنوں کی ایسی درجہ بندی کریں کہ جس سے وہ باہر کی طرف بڑھنے کے ساتھ باریک ہوجائیں، جس سے سوچ کی اہمیت کا اندازہ ہوجائیگا۔

جیسا کہ اخبار کا عنوان نمائندگی کرتا ہے، اب ہم زبان سیکھنے کے لئے ذہنی نقشہ کا استعمال کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ یہاں ہم دیکھیں گے کہ کس طرح ایک سادہ تکنیک کسی بچے کو بہتر طریقے سے سیکھنے میں مدد کرسکتی ہے۔ فی الحال، ہر اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک جامع تعلیم کے حصول کی کوشش کی جارہی ہے۔ لہذا ذہنی نقشہ بہت سارے بچوں کی ضروریات کو پورا کرسکتا ہے کیونکہ یہ ایک مختصر اور معصر بصری نمائندگی کا بہترین طریقہ ہے، جو تمام بصری ذریعہ سے سیکھنے والوں، ان لوگوں کے لئے جن کی توجہ کا وقفہ کم ہے، اور وہ جنہیں اٹینشن ڈیفسٹ ہائپر ایکٹو ڈس آرڈر ہے ان کے لیے

مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

اساتذہ کی اسباق کی منصوبہ بندی کرنے، انفرادی اختلافات کے حامل سیکھنے والوں کے لیے فراہمی، کم وقت میں زیادہ مواد کا احاطہ کرنے، معلومات کو منظم انداز میں پیش کرنے میں مدد فراہم کرسکتا ہے۔اس سے موجودہ دنیا میں طلباء کی مدد کی جاسکتی ہے جہاں بچے متعدد ہم نصابی سرگرمیوں میں شامل ہیں۔ یہ آلہ مختلف رنگوں میں ان کی توجہ اور کو مرکوز کرانے کے لئے مفید ہے۔کلیدی الفاظ یا مطلوبہ الفاظ کو اور مختلف جڑے ہوئے الفاظ کو سمجھنے، مرتکز ہونے، حفظ کرنے اور یاد رکھنے میں آسانی فراہم کرتا ہے۔مختلف تصاویر کسی بھی تصور کو سیکھنے، سمجھنے اور بازیافت کرنے میں بھی مددگار ہے۔ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ تدریس اور زبان سیکھنے میں ذہنی نقشہ کا استعمال کرنا اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لئے کارآمد ثابت ہوگا کیوں کہ ہر سیکنڈ میں معلومات کی مقدار میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔فطری طور پر زبان مختلف انسانوں میں مختلف ادوار سے گزرتی ہیہاں ہم جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ کیسے مائنڈ میپ زبان سیکھنے میں مددگار ہے۔

مائنڈ میپ (Mind Map) جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کسی بھی زبان کو سیکھنے میں الفاظ معنی (Vocabulary) میں پختگی مددگار ثابت ہوتی ہے، اس زبان کو استعمال کرنے اور معیاری زبان کو بات چیت میں لانے کے لئے اگر بچہ الفاظ معنی سیکھ لے تو ان کو مختلف جملوں میں استعمال کر کے اپنی بات واضح کرسکتا ہے، زبان کا معیار درجہ بدرجہ بڑھتا رہتا ہے اور بارہویں تک بچے بہت اچھے مضامین بخوبی اور باآسانی لکھ پاتے ہیں، کیونکہ مائنڈ میپ Mind Map کا استعمال کر کے ایک لفظ کو مختلف یکساں لفظوں سے بھی جوڑا جاسکتا ہے، کسی مخصوص سبق کے الفاظ بھی ایک مائنڈ میپ Mind Map میں پروئے جاسکتے ہیں اور متضاد کا بھی مائنڈ میپ Mind Map بنایا جاسکتا ہے۔

Reading Comprehension

Reading Comprehension کے لیے بچہ کو جو سبق پڑھایا گیا ہے، اس کا

مائنڈ میپ Mind Map بنواتے ہیں تو وہ سبق کی تلخیص Summary کرنے میں امداد فراہم کرتا ہے، بچہ اس کو گھر جا کر کر با آسانی خود ریوائز (Revise) کر سکتا ہے، جو اس کی یادداشت میں اضافہ کر سکتا ہے، اگر ٹیچر مائنڈ میپ Mind Map کا استعمال، پڑھانے میں کرتے ہیں تو یہ بچوں کے سمجھنے میں موثر ثابت ہوگا کیونکہ اس میں جانکاری منظم تصاویر اور مختلف رنگوں میں ہوتی ہے جو بچوں کی دلچسپی اور ان کی توجہ کے ساتھ ذہن پذیر ہونے کی قابلیت رکھتی ہے اسی سے بچے میں پڑھنے لکھنے کی رفتار میں اضافہ ہوگا۔

Phonetics سب سے پہلے کسی بھی زبان کو سیکھنے کے لئے اس کے حروف سے منسلک آوازوں کو سیکھنا ہوتا ہے، ہم ہر حرف کو اس کی صوت یا آواز کے ساتھ مائنڈ میپ (Mind map) اپنے ہاتھ یا ٹیکنالوجی کی مدد سے بنا سکتے ہیں، ۔مختلف صوتیات بھی ان کی تصاویر کے ساتھ مائنڈ میپ (Mind map) میں دکھائی جا سکتی ہے، اسی طرح حرف اور اس کی آواز اور جن الفاظ میں وہ پہلا حرف ہے ان کو مائنڈ میپ بنا کر بھی دجا سکتا ہے جیسے A اس کی آواز اور سیب کی تصویر۔ دوسری اسٹیج Semantics اور Morphology کی ہے، جس میں وسیع طور پر مائنڈ میپ کا استعمال کیا جا سکتا ہے مثلا الفاظ کی مختلف شکلیں (forms) بنانے کے لیے، متضاد اور مترادفات وغیرہ میں استعمال کیا جائے گا

Syntax گرامر میں بڑے پیمانے پر مائنڈ میپ کو برسر وکار لایا جا سکتا ہے مثلا جیسا کہ Pronoun Noun ، Adjective جملے، کیسے مضمون میں لکھیں؟ وغیرہ جو بہتر اور یاد رکھے جانے والے طریقوں سے بتایا جا سکتا ہے۔

Semantic کے تحت بچوں کو مائنڈ میپ کے ذریعے ایک لفظ سے متعلق مختلف الفاظ کو مائنڈ میپ کی مدد سے دیکھا یا جا سکتا ہے، اور مختلف الفاظ کا استعمال جملوں میں کیسے کریں اس میں بھی مائنڈ میپ معاون ثابت ہوگا۔

فہرست کتب: بوزان، ٹی (1976) اپنے دماغ کے دونوں اطراف استعمال کریں۔ نیو یارک: ای پی ڈٹن اینڈ کمپنی
بوزان، ٹی، اور بوزان، بی۔ (2000) دماغ کے نقشے کی کتاب (ملینیم ایڈیٹ)۔ لندن: بی بی سی بک۔
کیرول پوا، ڈوروتی لی، چیری لوئی اور شرلی چینگ ()' ابتدائی طلباء کے لئے انگریزی الفاظ کی تعلیم دینے کے ٹول کے طور پر ذہن سازی کا استعمال۔
کاسکوایم (2009) "غیر ملکی زبان کی تعلیم میں "دماغ کے نقشے" کا استعمال۔
حامد مراشی، مترا کینگانی (2018)' وضاحتی اور بیانیہ تحریری کلاسوں میں دماغی نقشہ سازی اور دماغی نقشہ سازی کا استعمال'۔ زبان اور ترجمہ کا جرنل جلد 8، نومبر 2، پی پی 106_93
جنس وانگ (2019)' انگریزی گرائمر کی تعلیم میں ذہن کے نقشے کے اطلاق پر تحقیق'۔ زبان مطالعات میں نظریہ اور عمل، جلد 9، نمبر 8، پی پی 990_995۔
AYOA.com کے ذریعہ تخلیق کردہ دماغ کے نقشے
موری اھلبرگ (2008)' عملی طور پر علمی نمائندگی کے طریق کار اور تکنیک خاص طور پر جو نقشہ سازی اور ذہن سازی سے متعلق ہیں۔ ہسٹری، انڈر پینٹنگز، سوفٹ ویئر اور موازنہ کی میز'۔
ایم عبداللطیف خان لیکچر دے رہے ہیں۔
سوچیں بوزان (2011)' دماغی نقشہ سازی سائنسی تحقیق اور متعلع ۔تھینک بوزان لمٹڈ ۔

☆☆☆

Jadid Dramon mein Nafsiyati Anasir by Dr. Mohammad Riaz (Asst. Prof.
SCS Govt. Degree College, Mendhar,(Poonch) cell-7298909670
ڈاکٹر محمد ریاض (اسسٹنٹ پروفیسر شری چھوٹے شاہ، گورنمنٹ ڈگری کالج مینڈر)

جدید ڈراموں میں نفسیاتی عناصر

عالمی پیمانے پر آج کا دور جدید کاری (Modernisation) کے دور سے بھی آگے بڑھ چکا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے ساتھ ساتھ مختلف علوم اور فنون میں بھی جدید ترین موضوعات، اسالیب اور رویے اپنائے جا رہے ہیں۔ چناں چہ علم نفسیات بھی اب فرائڈ، یونگ اور ایڈلر کے نظریات کی بہت ساری نئی تعبیریں اور تشریحیں سامنے آ ہی ہیں اور چوں کہ ان نفسیاتی تشریحات و توضیحات کے مطابق انسان کے ہر طرح کے اقوال اور اعمال کے پسِ پشت صرف اس کا شعور اور لاشعور یا تحت الشعور ہی نہیں اور بھی کوئی نہ کوئی نفسیاتی سبب یا محرک ضرور کارفرما ہوتا ہے انسان کے اعمال و افعال کا تعلق کسی نہ کسی جذبہ یا احساس سے ہوتا ہے۔ جذبہ اور احساس مثبت بھی ہو سکتا ہے اور منفی بھی، تعمیری بھی اور تخریبی بھی اس لیے انسان بہر حال ''خیر'' اور ''شر'' کا مجموعہ ہوتا ہے اور چوں کہ ادب خاص طور پر ڈراما بنیادی طور پر انسان کے مثبت یا منفی نیک یا بد، جذبات و احساسات کی ہی ترجمانی کرتا ہے۔ اس لیے جدید اُردو ڈراما میں بھی نفسیاتی عناصر کی پیش کش نفسیات کی جدید ترین تشریحات کے عین مطابق ہو رہی ہے۔

صنف ڈراما کے جدید ماہرین، بریخت، سیمویل بیکٹ وغیرہ تو یہاں تک مانتے

ہیں کہ کسی بھی خاص دور کے ڈراموں کا مطالعہ اس دور کی نفسیات کا بھی مطالعہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ ڈراما میں عصری سماجی وثقافتی حقائق اور مسائل کو محض واقعات یا قصہ دکھانے یا سنانے کے لیے پیش نہیں کیا جاتا بل کہ ڈراما کے کرداروں کے مکالمات افعال (Action) اور جسمانی اعضاء چہرہ، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں وغیرہ کی حرکات کے ذریعے داخلی جذبات وکیفیات کا بھی اظہار کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں خاص طور پر خود بر یخت (Bracht) کے جدید ڈراموں مثلاً 1.Three penny opera 2.Mother courage and her children 3.The caucasean chalk circle. وغیرہ ڈراموں میں اداکاروں نے جسمانی اعضا کی حرکت وگردش کے ذریعے جن کیفیات اور جذبات واحساسات کا اظہار کیا ہے۔ اِن سے بریخت کے عہد کے معاشرے کی نفسیات کا بخوبی انداز ہوتا ہے۔ اسی طرح اُردو کے جدید ڈراموں میں جن میں ''آگرہ بازار''۔ ''ناچا'' اور مٹی کی گاڑی وغیرہ اہم ہیں عصری معاشرے کی نفسیات کی ترجمانی نہایت فطری انداز میں کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ پچاس برسوں سے حبیب تنویر کے ڈرامے ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں اور غیر ممالک کی اُردو بستیوں میں نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کیے جارہے ہیں۔ خاص طور پر ''آگرہ بازار''، ''چرن داس چور'' وغیرہ ایسے مقبول ڈرامے ہیں کہ اب تک انھیں سوسو بار پیش کیا جاچکا ہے۔ اِن کی مقبولیت کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اُن ڈراموں کو پیش کرتے ہوئے حبیب تنویر نے عام انسانی نفسیات کی باریکیوں کو اپنے ذہن میں رکھا ہے۔ حبیب تنویر کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے تمام ناظرین کو ڈراما سے باندھے رکھنے کے لیے اوّل تو ایسے موضوع کہانی یا قصہ کا انتخاب کیا جس کا عام لوگوں کی نفسیات (جذبات واحساسات) سے گہرا تعلق ہو۔ دوئم یہ کہ حبیب تنویر نے مقامی قصّہ یا واقعہ کی پیش کش کے لیے مقامی کلاکاروں کا انتخاب کیا تاکہ واقعات اور مکالمات کی پیش کش فطری انداز میں ہو۔ اس کی عمدہ مثالیں ''ناچا'' اور ''چرن داس چور'' ہیں جن کا چھتیس گڑ

ھ کی لوک روایات، حکایات اور لوک گیتوں سے گہرا تعلق ہے۔ اِن ڈراموں میں موجود نفسیاتی عناصر کی وجہ سے ہی یہ ڈرامے کئی دہائیوں سے بار بار اسٹیج کیے جا رہے ہیں اور کتا بی صورت میں پڑھے بھی جا رہے ہیں۔ لوک کہانی، لوک گیت، لوک کلا کار اور محاورات و ضرب الامثال کی وجہ سے اُن ڈراموں کے ذریعے چھتیس گڑھ کی معاشرت اور ثقافت کی نفسیاتی تہوں کو جس طرح کھول کر پیش کیا گیا ہے یہ اسی کا نتیجا ہے کہ حبیب تنویر کے ڈراما ''، ''چرن داس چور'' کو کئی بین الاقومی ڈراما مقابلوں میں انعام واکرام سے نوازا جا چکا ہے۔

اُردو کے جدید ڈراموں میں نفسیاتی عناصر کی عمدہ مثالیں ڈاکٹر محمد حسن کے ڈرا موں میں ملتی ہیں۔ اس ضمن میں اُن کا ڈراما ''ضحاک'' مشہور ہے۔ یہ ڈراما ہندوستان میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کے عہد حکومت میں ایمرجنسی نافذ ہونے کے بعد سامنے آیا تھا۔ اس ڈراما میں اوّل تو ۱۹۶۵ء کی ہندو پاک جنگ کے حوالے سے استعاروں اور علا متوں کے ذریعہ مذہبی منافرت، فرقہ پرستی کو ایک نفسیاتی مرض قرار دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایمرجنسی کے دوران فرقہ پرست اور کٹر وادی، دایاں بازو کی سیاسی جماعتوں جو نے گمراہ کن رویہ اختیار کیا تھا ڈاکٹر محمد حسن نے اس کی تحلیل نفسی (Psychoanalysis) کر کے اِن فرقہ پرست اور تنگ نظر جماعتوں کی نفسیاتی کمزرویوں کی نشاندہی کی ہے۔

''ضحاک'' میں ڈاکٹر محمد حسن نے انسانی نفسیات کی تصویر کشی کس مہارت کے ساتھ کی ہے۔ اس کا انداز ''ضحاک'' کے چند کرداروں کے مکالموں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے ایمرجنسی کے دوران کسی کا بھی ضمیر مطمئن نہیں تھا اور ضحاک کے خوشامدی افسران اور درباری لوگوں کے وجود سے اس ضمیر کو بھی نکال کر پھینک دینے کے درپے تھے۔ گرچہ خود ان کا ضمیر بھی ایمرجنسی کے دوران مطمئن نہیں تھا۔ اطمینان اور سکون کیسے حاصل ہو اس کا جواب ہر کردار اپنی اپنی نفسیات کے مطابق دیتا ہے مثلاً

وزیر اعظم :۔ سوچنا ہوگا کہ ہمارے ضمیر کس طرح مطمئن ہوں گے (شاعر کی طرف دیکھتا

ہے)

شاعر:۔ضمیرایک کانٹا ہے جو ہمارے دِلوں میں کھٹکتا ہے۔

اُستاد:۔ہم اسے نکال پھینکیں گےاس کانٹے کی کھٹک کون کم کرسکتا ہے۔

جج:۔فقط قانون

رقاصہ:۔فقط نغمہ

شاعر:۔فقط شاعری

راہب:۔فقط مذہب

فوجی افسر:۔فقط طاقت کا استعمال

وزیراعظم:۔خاموش جاہلو!۔ضمیر ہمارا مسئلہ نہیں۔ہمارے سامنے اس سے زیادہ بھیانک سوال ہے ہمیں ہر روز انسانوں کے بھیجے درکار ہیں۔ا ۔

دراصل ڈاکٹر محمد حسن نے ضحاک میں اپیک تھیٹر کی جدید ترین تکنیک کو اپنا کر ایک شاندار ڈراما تخلیق کیا ہے جس کی سماجی معنویت آج بھی برقرار ہے اس ڈراما میں قصّہ کرداروں کے نفسیاتی برتاؤ (Psychological Treatment) کی وجہ سے آگے بڑھتا ہے انسانی وجود کی طرح انسانی معاشرے کی نفسیات میں بھی خیر اور شر، جبر وصبر نیکی اور بدی کی کش مکش ہمیشہ جاری رہی ہے ضحاک شر، جبر اور بدی کی علامت ہے فریدوں کا کردار ظلم اور ظالم کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کا استعارہ ہے اور مزدک انسانی مساوات کا علم بردار ہے۔اور یہی وہ تین نفسیاتی عوامل ہیں جن کی باہمی رسّہ کشی سے کسی بھی فرد واحد یا قوم کا مستقبل روشن یا تاریک ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے ضحاک میں ایرانی دیومالائی کرداروں کی مدد سے ہندوستان کی تاریخ کے ایک المناک دور ایمرجنسی (Emergency) کے دوران انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں اور زاویوں ،محبت اور نفرت ، اقتدار پسندی ، اذیت پسندی (Sadism) اذیت کوشی (Mesochism) خود پسندی یا نرگسیت (Narcism)

ذات پسندی اور خودغرضی (Selfishness) خوشامد پسندی وغیرہ کو جس طرح عصری سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل اور حقائق کے حوالے سے پیش کیا ہے۔اس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ جدید ڈراموں میں نفسیاتی عناصر کی اعلاترین اور مثالی پیش کش محمد حسن کے ڈرامے''ضحاک''، میں ملتی ہے۔اس لیے پروفیسر گیان چند جین نے''ضحاک'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''ضحاک ہر جگہ اور ہر زمانے میں پیدا ہوں گے ضحاک جہاں بھی سر اُٹھائے گا فریدوں کا یا اس کے کسی مظلوم بھائی یا بہن کا ہاتھ بھی ضرور اُٹھے گا۔اِن لوگوں کے ٹانکے کاٹ دو آو ہم ضحاک کی تلاش میں چلیں''[۲]

''ضحاک''، یعنی شر، بدی، ظلم و جبر، منفی سوچ اور فکر کی تلاش اور پیش کش کا یہ عمل اُردو کے دوسرے اہم جدید ڈراما نگار خواجہ احمد عباس، منٹو، شمیم حنفی، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی سے لے کر ظہیر انور تک کے ڈراموں میں نفسیاتی اسباب وعوامل کے تجزیول کے ساتھ ملتا ہے۔اگر دیکھا جائے تو اُردو میں جدید ڈراما نگاری کا باضابطہ آغاز وارتقا'' اپٹا'' IPTA کے پلیٹ فارم سے ہوتا ہے۔اس ضمن میں پہلا نام خواجہ احمد عباس کا آتا ہے جنھوں نے ۱۹۴۷ء میں اپنے ڈراما'' گاندھی جی اور غنڈا'' کے ذریعےعوام کو آزادی اور جمہوریت کی قدر اور تحفظ کے لیے نفسیاتی طور پر کمر بستہ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ خواجہ احمد عباس نے کئی جدید ڈرامے لکھے۔مثلاً'' بارہ بج کر پانچ منٹ''،''رپورٹر'' اور'' زبیدہ'' وغیرہ اِن ڈراموں میں''زبیدہ''، مکمل طور پر ایک نفسیاتی ڈراما ہے۔زبیدہ ایک روایت پسند اور فرسودہ رسوم ورواج، عقائد اور مفروضات کے شکار خاندان کی لڑکی ہے جس کی نفسیات پر اندھے عقائد اور غیر منطقی رواجوں کا غلبہ ہے لیکن جب وہ ملک میں عوام کی اصلاح اور بیداری، ایثار، اور قربانی کے ساتھ ساتھ انسان اور انسانیت اور ملک وقوم کی تعمیر وترقی میں کے لیے سرگرم تحریکوں سے آگاہ ہوتی ہے تو اس کے اندر زبردست نفسیاتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور وہ خود بھی اپنے ماحول اور معاشرہ کی اصلاح اور ترقی

کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصے لینے لگتی ہے۔

خواجہ احمد عباس نے اس ڈراما ''زبیدہ'' میں ڈراما کی ہیئت و تکنیک میں تجربہ بھی کیا ہے۔ اور شہری زندگی کی سیاسی و سماجی سرگرمیوں نعرہ بازیوں کا اس دور (یعنی آزادی کے آس پاس) میں ہندو مسلم تنازعہ، پاکستان کا قیام، فسادات اور ہجرت وغیرہ کے حوالے سے مسلمان گھرانوں کے افراد کی نفسیاتی الجھنوں، جذباتی کش مکش وغیرہ کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی لیے خواجہ احمد عباس کے ڈراما ''زبیدہ'' کا شمار اُردو کے نمائندہ جدید نفسیاتی ڈراموں میں ہوتا ہے۔

خواجہ احمد عباس کے ساتھ ہی اپٹا کے تحت سردار جعفری نے بھی کئی ایسے ڈرامے لکھے جو نفسیاتی اعتبار سے اہم ہیں۔ اِن میں سردار جعفری کا ڈراما ''یہ کس کا خون ہے'' بے حد اہم ہے۔ اس ڈراما میں نچلے اور متوسط طبقہ کو نفسیاتی طور پر سرمایہ دار (زمیندار، جاگیردار) طبقہ کی زیادتیوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس ڈراما میں سردار جعفری نے مظلوم طبقہ کے نمائندہ رفیق کی، ظالم طبقہ کے نمائندہ علی حسن پر فتح کا منظر پیش کر کے یہ درس دیا ہے کہ اگر مظلوم طبقہ اپنے غم و غصہ جذبات اور اِرادوں کو نفسیاتی طور پر منظم کر لیں تو ہر جور و ظلم کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کرشن چندر نے اپنے ڈراما ''ردوازے کھول دو'' میں عوامی سوچ و فکر کا رُخ قومی یک جہتی، اتحاد اور انسان دوستی کی جانب موڑنے کی کوشش کو نفسیاتی حربہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی اپنے افسانوں میں ہی نہیں ڈراموں میں بھی نفسیاتی تہوں کو کھول کر واقعات اور کرداروں کو لافانی بنانے کے لیے مشہور ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے چھ ڈراموں پر مشتمل مجموعہ ''بے جان چیزیں'' اور دوسرے مجموعہ ''سات کھیل'' میں ''نقل مکانی'' ''چانکیہ'' اور خواجہ سرا'' وغیرہ ایسے کئی ڈرامے ہیں جن میں نفسیاتی عناصر ڈراما کے موضوع اور کہانی کے تاثر میں اضافہ کرتے ہیں۔ اسی طرح عصمت چغتائی نے اپنے ڈراما ''دھانی بانکیں'' میں ہندو مسلم فسادات کے تناظر میں عام لوگوں کی نفسیات کی تعمیری تنظیم و تہذیب پر زور دیا

ہے۔ اِن کے علاوہ سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک وغیرہ کے افسانوں میں بھی نفسیا تی عناصر کی کمی نہیں۔

جدید ڈراموں میں قدسیہ زیدیؔ، انور اعظیمؔ، سید محمد مہدیؔ، سریندرؔ ورما وغیرہ نے بھی اپنے ڈراموں میں انسانی نفسیات کے مختلف اور متضاد پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔

ہندوستان میں ۷۰۔۱۹۶۰ء تک آتے آتے ریڈیو اور ٹیلی وژن پر ہزاروں ڈرامے پیش کیے گے اِن میں تعمیری اور تفریحی پہلو تو تھے ہی انسانی نفسیات کی تطہیر کے عناصر کی بھی کمی نہیں تھی۔ پاکستان میں خاص طور پر امجد اسلام امجد کے متعدد ڈرامے ایسے ہیں جن میں پاکستان کے مختلف علاقوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے جاگیردارو ں، کسانوں، تعلیم یافتہ افراد اور غیر تعلیم یافتہ، مزدوروں، سیاست دانوں اور تاجروں، دولت مندوں اور مفلسوں کی نفسیات کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ امجد اسلام امجد کے ایسے ڈراموں میں ''وارث''، ''دہلیز''، ''سمندر''، ''ایندھن'' وغیرہ ۱۹۸۰ء تک آ تے آتے اُردو میں جدیدیت کے رُجحان نے جہاں ایک طرف اُردو شاعری اور افسانے کو متاثر کیا وہیں ڈراما بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چناں چہ جس طرح مغربی اد ب کے علامتی اور تجریدی افسانوں کی ہیئت اور تکنیک سے متاثر ہو کر اُردو میں بھی علامتی، اساطیری اور تجریدی افسانے کثرت سے لکھے جانے لگے اسی طرح بریخت اور سیمویل بیکٹ کے ڈراموں کے زیر اثر اُردو میں بھی ایپک اور ابسرڈ (EPIC and Absured) ڈرامے لکھے گئے اُردو میں ایپک اور ابسرڈ ڈرامے جن ادیبوں نے لکھے اِن میں کمار پاشی، شمیم حنفی، انور عظیم، زاہدہ زیدی اور آفاق احمد وغیرہ اہم ہیں۔

اِن کا ذکر گذشتہ ابواب میں کیا جا چکا ہے۔ لیکن اِن کے جن ڈراموں میں خاص طور پر نفسیاتی عناصر ملتے ہیں وہ اس طرح ہیں۔

۱۔ کمار پاشی.....اندھیرے کے قیدی

۲۔ شمیم حنفی..... پانی پانی، مٹی کا بلاوا

۳۔زاہدہ زیدی.....دوسرا کمرہ، چٹان
۴۔انور عظیم.....آوازوں کے قیدی
۵۔آفاق احمد .....چنگیز، آلائشِ محفل

اکیسویں دہائی میں کئی نئے ڈراما نگاروں نے خاص طور پر اپنی تخلیقات میں نفسیاتی نکات پیش کرنے کی کوشش کی۔ اِن میں نوجوان ڈراما نگار ظہیر انور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

ظہیر انور ڈراما نگار تو ہیں ہی اداکار بھی ہیں اور ڈائریکٹر بھی اسی لیے، اِن کے جدید ڈراموں کے مجموعے ''بلیک سنڈے'' میں جو دس ڈرامے شامل ہیں اِن میں خاص طور پر ''خوابوں کا سویرا، ''ہوتا ہے شب و روز''، ''بلیک سنڈے'' اور ''دہشت کا بوجھ'' وغیرہ ایسے ہیں جن میں واقعات اور کرداروں کے نفسیاتی زاویوں کو گرفت میں لے کر ملک و قوم کے سماجی و ثقافتی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

دراصل ڈراما میں انسانی نفسیات کی اُلجھنوں، نشیب و فراز اور کش مکش پر ہی ڈراما کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے اور چوں کہ آج گلوبلائزیشن، کنزیومرازم، انٹرنیٹ اور مارکیٹنگ کلچر کے سبب چھوٹے اور بڑے سبھی معاشروں میں لوگ کسی نہ کسی طرح کے نفسیاتی دباؤ اور کش مکش میں زندگی گذارنے پر مجبور ہیں جدید اُردو ڈراما کے نفسیاتی عناصر اسی انتشار اور بحران کے ترجمان بھی ہیں اور اِن کے علاج کا وسیلہ بھی۔

☆☆☆

نظمیں Nazmein

پروین شیر (نیویارک۔امریکہ)
Parvin Shere (Newyork,USA)
cell-001-650-6565-271

ڈھونڈتی ہوں تمہیں
Dhondti hoon Tumhein

ملگجے تھے اجالے
اندھیرے سے دست و گریبان ہوتے
ہوئے!
شور کرتے ہوئے
اور تم
بے بسی میں مری سمت تکتی ہوئی
لمحہ لمحہ بہی جا رہی تھیں ادھر
جس طرف اونچی لہروں کی دیوار تھی
چھٹپٹاتی ہوئی
تم بھنور میں گھری
لحظہ لحظہ سراسیمہ، بے دم ہوئی جا رہی تھیں
مگر میں تمہاری پکڑ سے بہت دور تھی
لڑ رہی تھی امڈتے ہوئے پانیوں کے بگولوں
کی یلغار سے
تا کہ باہوں میں بھر کر
تمہیں ڈوبنے سے بچاؤں۔۔۔
کنارے پہ لاؤں تمہیں

اونچی آواز میں چیختے چیختے
ہو کے بے بس میں تم کو بلاتی رہی
کسمساتی رہی

پھر نہ جانے بھنور کہاں، کس طرف تم کو
پانی کے ریلے میں گم کر دیا
دھند گہری تھی، موجیں بلا خیز تیزی سے اٹھتی
ہوئیں
م کو اپنی فصیلوں کے اس پار جانے کہاں
لے گئیں
اور میں۔۔۔
بے اماں، بے سہارا، مصیبت زدہ
اپنے اشکوں کی مشعل جلائے ہوئے
ماندگی سے تھکاوٹ سے ٹوٹی ہوئی
اب کنارے پہ سودائیوں سی کھڑی
ڈھونڈتی ہوں تمہیں
گھپ اندھیرے میں ماں

☆☆☆

Chandrabhan Khayal (Delhi)

cell-9873334899

چندر بھان خیال (دہلی)

وقت آپس میں الجھنے کا نہیں۔۔

Waqt Aapas mein Uljhne ka nahin--

وقت آپس میں الجھنے کا نہیں ہے یارو!
آؤ اس دور میں جینے کا طریقہ ڈھونڈیں
امن عالم کے تحفظ کا سلیقہ ڈھونڈیں
دور اخلاص کی بنیاد ہے، بینائی ہے
در حقیقت یہ رخ زیست کی رعنائی ہے
درد انسان کی سانسوں میں گھلا امرت ہے
درد اک کیف ہے،اک موج توانائی ہے
درد انساں کا مقدر ہے فرشتوں کا نہیں
اس کی لذت کو بھلا شمس وقمر کیا جانیں
اس کا محتاج ابھی عرش بریں ہے یارو!
وقت آپس میں الجھنے کا نہیں ہے یارو!
کیا ضروری ہے کہ ہر بات میں وش ہی گھولیں
بھائی بہنوں سے سیاست کی زباں ہی بولیں
کیا ضروری ہے کہ آئندہ نئی نسلیں بھی
جنگ وظلمات کے ماحول میں آنکھیں کھولیں
خرمن راحت و ظلمت کو جلا ڈالے گا
ہم پہ طاری یہ خطرناک سیاست کا جنوں
جس کا دنیا میں نہ ایماں ہے نہ دیں ہے یارو!
وقت آپس میں الجھنے کا نہیں ہے یارو!
امن کے گھر میں فسادوں کا بسیرا کیوں ہے
منبع نور کے سینے میں اندھیرا کیوں ہے
ہم تو رکھتے ہیں ہر اک فکر کی وسعت پہ یقیں
پھر ہمیں تنگ خیالات نے گھیرا کیوں ہے
ہم اگر تنگ حساروں سے نہ باہر نکلے
اپنی دھرتی بھی ہمیں تنگ نظر آئے گی
یوں بھی ہم لوگوں سے بیزار زمیں ہے یارو!
وقت آپس میں الجھنے کا نہیں ہے یارو!
زندگی موت کے پر ہول نظاروں میں نہیں
زندگی ظلم کے بڑھتے ہوئے دھاروں میں نہیں
دست تخریب سے تعمیر نہیں ہو سکتی
عافیت دہر کی ایٹم کے غباروں میں نہیں
شان تنظیم کی طاقت سے بڑھا کرتی ہے
ہستیء قوم بھی قائم ہے اسی کے دم سے
حسن تنظیم سے یہ زیست حسیں ہے یارو!
وقت آپس میں الجھنے کا نہیں ہے یارو!

☆☆☆

Dr. Shabnam Ashai (Srinagar)
cell-9797795748
ڈاکٹر شبنم عشائی (سرینگر)

خوشی چھوتی نہیں
دکھ بستا ہے
من مسافر ہے
جانے کن زمانوں کی
طراوت کھوجنے
ہر پل سفر میں رہتا ہے
بنجر سرزمینوں میں
خنک چشموں کے
خواب بو دیتا ہے
تعبیریں پھوٹتی نہیں
دکھ اگ جاتا ہے
دکھ جب اگنے لگتا ہے
من کی ساری نمی
لے لیتا ہے
آنکھوں کی نمی اور خواب
دونوں سوکھ جاتے ہیں
اور دکھ
بس جاتا ہے۔

☆☆☆

محبت
تمہاری دہلیز پر
180 دن اونگھتی رہی
تم مورکھ
181 ویں دن
جب گھر پہنچے
تو گھر مکان میں
بدل چکا تھا
اور محبت
درد میں!
اب درد کیا جیو گے؟
تم Technics جیتے جیتے
نہ جانے کب
انسان سے
Machine میں بدل گئے ہو
لباس تو بدل ڈالو!

☆☆☆

Parvez Muzaffar (Birmingham U.K.) cell-0044-7814783097
پرویز مظفر (برمنگھم، یو۔کے)

Huqooq حقوق

کیسے کیسے لوگ ہیں
بھولے سے آتے ہیں نظر
مگر/ کچھ اور ہی ہیں وہ
ساتھ میں چل رہے ہیں جو
حصار میں اپنے
لے لیں گے تمہیں
آنکھ جب بھی کھلے گی
دیر نہ ہو جائے کہیں
ذرا دھیان سے
تیر نکل چکا ہے کمان سے
جو چپ تھے اب تک
تماشے کے کردار تھے
اس جنگ سے باہر تھے
ہزاروں کے قتل کے بعد
اب گفتگو کر رہے ہیں
آن بان کی

☆☆☆ ذرا دھیان سے

Hindola ہنڈولا

آنکھوں میں
ہنڈولے سا
جھولتا وقت
بیتی دنیا یاد آنے لگی
رنگین بستیوں میں
خلوص سے بھرے دل
محبت کے وہ کنویں، تالاب
وہی آب پی کر
تعمیر ہوئی ہمارے بدن کی عمارت
جسے ہم منتقل کرنا چاہتے ہیں
اس میں
جو مستقبل ہے
مگر وہ مانتا ہی نہیں
اسے نئے بدن کی تلاش ہے
ہماری خواہش
ایک طرف
اس کی مختلف پیاس ہے

☆☆☆

غزلیں Ghazlein

Aslam Imadi (Hyderabad)
cell-9966683014
اسلم عمادی (حیدرآباد)

قریہ فکر میں سناٹا بسا میرے بعد
آخری شخص تھا میں کچھ نہ بچا میرے بعد

نہ جلا پھر کبھی احساس کا رنگیں دامن
پھر نہ آیا کوئی یاں شعلہ رواں میرے بعد

ایک اک سانس کو ترسا کیا ،کیا موسم تھا
سنتے ہیں شہر میں پھرتی ہے ہوا میرے بعد

میرا پیکر نہ بچا ۔کوچہ دلدار میں کیوں
چاپ سی پھر بھی ابھرتی ہے صدا میرے بعد

ٹوٹنا ،ٹوٹتے رہنا تو ہے اک رسم جنوں
اہل دل ہی جو نہیں،ٹوٹا کیا میرے بعد

قاتل شہر بھی کس سکھ سے جئے گا اسلم
حوصلہ کس میں؟ کرے گا جو گلہ میرے بعد

☆☆☆

(2)

آنکھوں سے لہو چیخنے والے نہ رہیں گے
ہم بجھ گئے تو زخمی اجالے نہ رہیں گے
بہکائیں گے پھر ہنستے ہوئے وحشی اجالے
ہم کوئی گھڑی خود کو سنبھالے نہ رہیں گے
اے شب تری گہرائی میں چھپ جائیں گے ہم سب
اے صبح ترے چاہنے والے نہ رہیں گے
اک بوڑھی ہے دیوار کے سائے میں پڑی ہے
دیوار گرے گی تو یہ نالے نہ رہیں گے
اک بجھتی ہوئی آگ خدا بننے لگے گی
ہم سب تری وحشت کے حوالے نہ رہیں گے
جاری رہے گر پیکر و احساس کی یہ جنگ!
یہ زہرہ جبیناں ،یہ جیالے نہ رہیں گے
آنکھوں میں اتر جائیں گی منظر کی سلاخیں
پھر خوابوں کے یہ دھندلے اجالے نہ رہیں گے
اک بچہ ہے جو کاغذی کشتی پہ رواں ہے
اسلم تجھے امکان سنبھالے نہ رہیں گے

☆☆☆

Ahmad Shanas (Jammu)
cell-8803500711
احمد شناس (جموں)

ادھورا سا ہوں کچھ پورا نہیں ہوں
میں اس تصویر میں ہوں یا نہیں ہوں
میں اس دیوار سے نکلا نہیں ہوں
جو شیشے میں ہے وہ چہرا نہیں ہوں
کہیں اندر ہی اندر بجھ گیا ہوں
بہت دن ہو گئے رویا نہیں ہوں
تجھے تو عشق ہے پرچھائیوں سے
مگر میں جسم ہوں سایہ نہیں ہوں
جہاں میں ہوں وہاں موجود ہے وہ
میں تنہا ہوں مگر تنہا نہیں ہوں
کناروں سے نکل جاتا ہوں اکثر
میں تیرے ہاتھ میں پورا نہیں ہوں
بدن کا ایک خانہ روح کا ایک
میں اس تقسیم کو سمجھا نہیں ہوں
اب آتے ہی نہیں وہ خواب مجھ کو
میں چڑیوں کی طرح اڑتا نہیں ہوں
جو دکھ میرا ہے اوروں کا نہیں ہے
تو کیا میں اپنی بستی کا نہیں ہوں
جو میں سمجھا ہوں تو ایسا نہیں ہے
جو تو سمجھا ہے میں ویسا نہیں ہوں
الف۔ب۔جیم سے بہلا نہ مجھ کو
کہ میں اسکول کا بچہ نہیں ہوں
مجھے ہے دوستوں کے ساتھ رہنا
میں اپنے زخم دکھلاتا نہیں ہوں
نہ جانے اور میں کیا کیا ہوں احمدؔ
نہ جانے اور میں کیا کیا نہیں ہوں

☆

لکیریں کھینچتے ہیں قاعدوں کی بات کرتے ہیں
ریاضی جاننے والے یہاں اچھے نہیں لگتے
ہوا میں اڑنے والے ریت کے گھر ہم بناتے ہیں
ہمیں یہ اینٹ پتھر کے مکاں اچھے نہیں لگتے

☆

ہم کو اتنی سی خبر چاند کی ہے
بس یہی ہے کہ نظر چاند کی ہے
بیچ میں ان گھنے درختوں کے
دور تک ایک ڈگر چاند کی ہے

☆

اب کوئی گھڑا عشق میں کچا نہیں ہوتا
ہوتا ہے سفر آبلہ پائی نہیں ہوتی
اک خوف کا پہرا ہے مری نیند پہ احمدؔ
انسان کی یہ رات خدائی نہیں ہوتی

Omar Farooq عمر فاروق

پتھر کے بت خلا میں بدلتے ہوئے ملے
ایسے ہی رات دن مجھے ڈھلتے ہوئے ملے
میں کھو گیا تھا اپنی ہی محفل کی بھیڑ میں
سب ایک دوسرے سے بچھڑتے ہوئے ملے
آندھی میں رقص کرنے کی کوشش فضول ہے
صحرا سے لے کے دشت اجڑتے ہوئے ملے
موسم مزاج لوگ ہمیشہ سے تھے الگ
وقفے کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے ملے
چلنے کی ضد نے گھر کے تقاضے بدل دئے
بیٹھے ہوئے یہ لوگ بھی چلتے ہوئے ملے

(2)

اتنا ملبہ ہے کسی ذات کے ڈھہ جانے کا
ایک خطرہ ہے کئی باندھ کے بہہ جانے کا
دیکھ گفتار کی جھنکار ابھی زندہ ہے
چپ سے بہتر ہے کوئی لفظ ہی کہہ جانے کا
خود کو پامال نہ کر گرچہ بدن خاک کا ہے
ہر تعلق میں تو ہر غم نہیں سہہ جانے کا
کون آیا ہے چراغوں سے ضیا لینے کو
رات کے بعد کوئی ڈر نہیں رہ جانے کا
پھر سے تعمیر ہے مضمر یہاں تخریب کے ساتھ
غم نہ کر اپنی یہ دیوار کے ڈھہ جانے کا

(3)

ایک روٹی کے لئے خاک ہوئے جاتے ہیں
سیدھے سادے سبھی سفاک ہوئے جاتے ہیں
جن کو آداب سکھایا تھا سر منبر وہ
گفتگو کرنے میں بے باک ہوئے جاتے ہیں
اپنی وحشت کے تقاضوں کا جنہیں علم نہیں
دشت فرقت میں وہ سب چاک ہوئے جاتے ہیں
اتنا بوجھل ہے ترے لفظ کے معنی کا طلسم
شوخ لہجے سبھی نمناک ہوئے جاتے ہیں
بے حیائی نے ردا چھین لی سر سے جن کے
برہنہ جسم ہی پوشاک ہوئے جاتے ہیں

(4)

چوغہ بدل رہا ہے قلندر دھمال میں
چلئے کہ دیکھتے ہیں اسے اس کے حال میں
گذری ہے عمر پر کو کترتے ہوئے تمام
صیاد پھنس گیا ہے ابھی اپنے جال میں
گردش میں آفتاب کبھی ماہتاب تھا
الجھا رہا فقیر انہیں ماہ و سال میں
حیرت سے تک رہے تھے سبھی اس کو بزم میں
ایسا تھا نور میرے صنم کے جمال میں
سارا عروج اپنی کہانی میں کھو گیا
سارا عروج میں نے کھنگالا زوال میں

☆☆☆

Pawan Kumar (IAS) Lucknow

cell-9412290079

پون کمار (آئی۔اے۔ایس) لکھنو

آسمان پہ گھٹا چھا گئی
مجھ کو تیری یاد آ گئی
تم نے اپنے لب کیا کھولے
سرد ہوا کچھ گنگنا گئی
ہم سے پوچھو رات کا مطلب
تم کو تو بس نیند آ گئی
پیار ہے کیا جب اس سے پوچھا
جاتے جاتے مسکرا گئی
شور تھا ان کی خاموشی میں
چیخ ہماری بے صدا گئی
اس کو بھی کوئی راس آ گیا
مجھ کو بھی کوئی راس آ گئی
بعد تمہارے یہی ہوا بس
جسم رہ گیا آتما گئی
یاد آ گیا کوئی اچانک
آنکھ ہماری ڈبڈبا گئی

☆☆☆

(2)

زمیں کو ناپ چکا آسمان باقی ہے
ابھی پرندے کے اندر اڑان باقی ہے

بدھائی تم کو کہ پہنچے تو اس بلندی پر
مگر یہ دھیان بھی رکھنا ڈھلان باقی ہے

میں اپنی نیند سے قسطیں چکاؤں گا کب تک
تمہاری یاد کا کتنا لگان باقی ہے

میں ایک موم کا بت ہوں تو دھوپ کا چہرہ
بچے گی کس کی انا امتحان باقی ہے

مجھے یقین ہے ہو جاؤں گا بری اک دن
مرے بچاؤ میں اس کا بیان باقی ہے

یہ بات کہہ نہ دے سیلاب سے کوئی جا کر
تمام شہر میں میرا مکان باقی ہے

ابھی تو چپ ہوں مگر داستاں سناؤں گا
ابھی تو منہ میں ہمارے زبان باقی ہے

☆☆☆

Zulfeqar Naqvi(Mendhar, Poonch)cell-9797580748
ذوالفقارنقوی (مینڈھر، پونچھ)

مجھے فرسودہ ذہنی کا کوئی الزام مت دینا
تمہارا ہم سفر ہو جاؤں یہ پیغام مت دینا
مرا سوز دروں ملتا نہیں ہے ساز سے تیرے
یہ نغمہ گا نہ پاؤں گا ، مجھے یہ کام مت دینا
مرا ایمان کی بستی میں جی لگتا ہے، رہنے دو
کواکب اپنی دنیا کے مجھے انعام مت دینا
زمانے کی فسوں کاری نہ سکھلا مجھ کو تو واعظ
مری دنیا طرب آمیز ہے آلام مت دینا
ریا کاری ونخوت اور نفرت ہے زمانے میں
تم ایسے دور کو تہذیب کا کچھ نام مت دینا
مری دنیا الگ ہے اور ترا قصہ جدا گانہ
مرے روشن سویروں کو تم اپنی شام مت دینا
نہیں ہے بوئے حقانی ترے ان مئے کے پیالوں میں
کہ اس زہر ہلاہل کا مجھے تو جام مت دینا
خدا وندا ، ترے نقوی کی بس اتنی تمنا ہے
نہیں جو عین دین حق ، اسے وہ کام مت دینا

☆☆☆

(2)

درمیان پاسبان شش جہات
تشنہ لب ہوں بر لب نہر فرات
یہ جہان رنگ و بو یہ قیل و قال
آج تک ادراک میں آئی نہ بات
کر رہی ہے ساری دنیا انحراف
از حدیث زندگی، علم حیات
تو سبک دنیا ہے محو خرد و نوش
رہ گئی تیری سمٹ کر کائنات
ہو گئے زیب گلو دو ایک پھول
دل پہ کانٹوں کے گراں گزری یہ بات
کینہ و بغض و عداوت اتہام
کر حذر اس سے کہ مل جائے نجات
زور حیدر اور ہو عزم حسین
پھر دکھا سکتا ہے انساں معجزات
منتظر پھر سے سحر ہے ایک بار
کالی زلفیں کب سمیٹے گی یہ رات

☆☆☆

سہیل اقبال Sohail Iqbal (KSA)
whatsapp no. 00966-5547-11667

مرے علاوہ مرے قافلے میں کوئی نہیں
سو خوش ہوں اب کہ مرے راستے میں کوئی نہیں
سبھی کے پاس ہے سب کچھ مزے میں کوئی نہیں
شراب پی تو رہے ہیں نشے میں کوئی نہیں
وہ جن کے ساتھ گزرتے تھے میرے لیل و نہار
اب ان کا ساتھ تو کیا رابطے میں کوئی نہیں
بڑی طویل تھی فہرست دشمناں لیکن
خدا کا شکر مرے حافظے میں کوئی نہیں
اگر یہ دل ہے ترا آئینہ تو پھر سن لے
میں کیسے مان لوں اس آئینے میں کوئی نہیں

(2)

یقین پہلے گیا تھا سو اب گماں بھی گیا
کہ میرے دل سے اک اندیشہء زیاں بھی گیا
عجیب رنگ دکھائے ہیں مفلسی نے مجھے
جہاں مجھے نہیں جانا تھا میں وہاں بھی گیا
وہ تیرا شہر ہو صحرا ہو یا سمندر ہو
خود اپنے آپ کو ثابت کیا جہاں بھی گیا
کسی نے پیروں تلے سے زمین کھینچی تھی
مگر یہاں تو مرے سر سے آسماں بھی گیا
تمام شہر نے بارش کی جب دعا مانگی
تو میرے ہاتھ سے ٹوٹا ہوا مکاں بھی گیا

(3)

اپنی محبتوں کا یوں چرچا نہیں کیا
ہم نے کبھی بھی آنکھ کو دریا نہیں کیا
ایسا نہیں سفر میں مرے مشکلیں نہ تھیں
گھر لوٹنے کا پھر بھی ارادہ نہیں کیا
مجبور ہم کو جان کے کوئی خرید لے
غربت میں خود کو اتنا بھی سستا نہیں کیا
عزت کو دی ہمیشہ سے دولت پہ فوقیت
ہم نے کبھی بھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا
سوچا ہے تم نے یہ کبھی اس نے تمہیں سہیلؔ
اپنا تو کہہ دیا مگر اپنا نہیں کیا

(4)

کل رات ماہتاب سے ٹکرا گیا تھا میں
اک حسن بے حجاب سے ٹکرا گیا تھا میں
وہ دن تو ہوگا آپ کے ماضی کی یادگار
رستے میں جب جناب سے ٹکرا گیا تھا میں
پھر یوں ہوا کہ زندگی یکسر بدل گئی
اپنے ہی انتخاب سے ٹکرا گیا تھا میں
کانٹوں کے زخم ہیں جو مرے دل پہ آج تک
گلشن میں اک گلاب سے ٹکرا گیا تھا میں
پتلا ہوں ایک موم کا یہ جانتے ہوئے
صحرا میں آفتاب سے ٹکرا گیا تھا میں

☆☆☆

Irfan Arif (Poonch)'
cell-9682698032
عرفان عارف (پونچھ)

ظلم کی حد بے کراں ہو جائے گی تم دیکھنا
خامشی آتش فشاں ہو جائے گی تم دیکھنا

پھول جیسی بچیوں کا قتل جن کے سر پہ ہے
نسل ان کی بے نشاں ہو جائے گی تم دیکھنا

کب دبانے سے دبی ہے حق پرستوں کی صدا
ہر صدا سیل رواں ہو جائے گی تم دیکھنا

اپنا رہبر کھو دیا لیکن خودی باقی رہی
یہ دلیری داستاں ہو جائے گی تم دیکھنا

بادشاہی کی ہوس میں جو پھرے ہے چارسو
اس کی سرداری دھواں ہو جائے گی تم دیکھنا

شان میں ان کی جھکا دے گا جبیں عرفانؔ بھی
یہ زمیں بھی آسماں ہو جائے گی تم دیکھنا

☆☆☆

(2)

نو عمر کئی تم نے شجر کاٹ دئے ہیں
کیوں وقت کے پہلے ہی ثمر کاٹ دئے ہیں

کچھ ایسی چلی اب کے ہوا بغض و حسد کی
اپنوں نے ہی خود اپنوں کے سر کاٹ دئے ہیں

دشمن کی نظر آج غضب ناک بہت تھی
بس ماں کی دعاؤں نے اثر کاٹ دئے ہیں

آ جائے گی منزل ابھی بس آتی ہی ہوگی
اس آس کی کشتی پہ سفر کاٹ دئے ہیں

ہے مول سہی پھر بھی انہیں کم نہ سمجھنا
ان اشکوں نے پتھر کے جگر کاٹ دئے ہیں

ہم نے شب غم با رہا امید سحر پر
لمحات میں صدیوں کے سفر کاٹ دئے ہیں

ہیں گھات میں کچھ ایسے شکاری کہ جنہوں نے
اڑتے ہوئے پنچھی کے بھی پر کاٹ دئے ہیں

کیسا یہ جنون جس نے کہ طوفاں کو جکڑ کر
دریائے محبت کے بھنور کاٹ دئے ہیں

کچھ میری تھکن کا بھی کر احساس مرے دوست
میں نے بھی ترے ساتھ سفر کاٹ دئے ہیں

عارفؔ یہ دعا ہے کہ زمانے میں رہے امن
کتنے ہی تعصب نے بشر کاٹ دئے ہیں

☆☆☆

Maulana Wahiduddin Khan : Baseeraton ka Alam bardar by Mufti Reyaz

Ahmad Dar (Himalayan Degree College, Rajouri) cell-9160966456
مفتی ریاض احمد ڈار (ہمالین ڈگری کالج، راجوری)

مولانا وحید الدین خان: بصیرتوں کا علمبردار

مولانا وحید الدین خان (1925-2021) بیسویں اور اکیسویں صدی کے ان ممتاز اسلامی مفکرین، مدبرین اور مصلحین میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے دورِ جدید میں اسلام کی تعبیر وتشریح کو جدید علمی، سائنسی اور فکری اصطلاحات میں پیش کیا۔ اس اندازِ فکر نے اسلام کے پیغام کو جدید انسان کے ذہن کے لیے نہ صرف قابلِ فہم بنایا بلکہ اسے عصرِ حاضر کے فکری تقاضوں سے ہم آہنگ انداز میں سمجھنے کا موقع بھی فراہم کیا۔ مولانا کی علمی وفکری جہات کا جامع تعین کرنا اور ان کی فکر کی سطح ووسعت کو متعین کرنا ایک نہایت مشکل امر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تصانیف کا ہر عنوان، خصوصاً رسالہ ''الرسالہ'' کا ہر صفحہ، ان کی بلند علمی بصیرت، گہرے فکری شعور اور غیر معمولی تحقیقی معیار کی گواہی دیتا ہے۔ ان کی تحریروں میں حکمت، اعتدال، فکری وسعت اور عصری شعور کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جو قاری کو غور وفکر کی نئی جہات سے روشناس کراتا ہے۔

مولانا وحید الدین خان اپنی ذات میں ایک جامع اور ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ وہ بیک وقت مفکر، مدبر، مصلح، فلسفی، مورخ، جدید علمِ کلام کے ماہر، دورِ حاضر کے عظیم مبلغ اور معرفتِ ربانی کے سچے پیکر تھے۔ اکیسویں صدی میں ان جیسی ہمہ گیر علمی وفکری شخصیت کی مثال پیش کرنا ناممکن تو نہیں، لیکن یقیناً نہایت مشکل امر ہے۔

مولانا کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ وقت اور حالات کے تقاضوں کو

نہایت گہری بصیرت کے ساتھ سمجھتے تھے اور ان کے مناسب حل پیش کرنے کا غیر معمولی ملکہ رکھتے تھے۔ عصرِ حاضر میں اسلام کو جن جدید علمی، سائنسی اور الحادی چیلنجز کا سامنا تھا، مولانا نے اپنی غیر معمولی علمی فراست اور فکری بصیرت کے ساتھ ان چیلنجز کا ادراک کیا۔ انہوں نے نہ صرف ان کو سنجیدگی سے قبول کیا بلکہ جدید علمِ کلام کے اسلوب میں معقول، مدلل اور سائنسی انداز میں ان کا جواب پیش کیا۔

مولانا کی تحریروں اور تقاریر کا امتیاز یہ ہے کہ ان میں گہرائی فکر کے ساتھ سادگیِ بیان بھی موجود ہے۔ انہوں نے پیچیدہ علمی وفکری مباحث کو اس انداز سے پیش کیا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی بآسانی ان کو سمجھ سکے۔ اس طرح مولانا وحید الدین خان نے دورِ جدید میں اسلام کی فکری اور دعوتی تعبیر کو ایک نئے اور موثر انداز میں پیش کر کے اسلامی فکر کے میدان میں ایک نمایاں اور دیرپا علمی خدمت انجام دی۔

مولانا کی علمی خدمات: مولانا وحید الدین خان کی علمی خدمات نہایت وسیع اور ہمہ گیر ہیں۔ ان کی تصنیفی وفکری کاوشوں کا مکمل احاطہ کرنا یقیناً ایک مشکل کام ہے، کیونکہ انہوں نے مختلف علمی، فکری اور دعوتی میدانوں میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی تحریروں میں اسلام کے بنیادی عقائد، انسانی زندگی کے روحانی پہلو، اور دورِ جدید کے فکری مسائل کا نہایت بصیرت افروز اور مدلل انداز میں جائزہ ملتا ہے۔

مولانا نے جن اہم موضوعات کو اپنی تحریروں اور تحقیقات کا مرکز بنایا، ان میں بالخصوص قرآنیات، رسالت اور سیرتِ نبوی، اسلامی تاریخ، دعوت الی اللہ، تجدیدِ دین، عالمی امن، بین المذاہب مکالمہ اور ڈائیلاگ، روحانیت، تزکیہ نفس، توحید اور معرفتِ الٰہی جیسے بنیادی موضوعات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مذہب اور سائنس کے باہمی تعلق، الحاد اور جدید فکری شبہات، نیز سماجی اور معاشرتی بگاڑ کے اسباب وحل پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔

مولانا کی تحریروں کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے اسلام کی فکری اور

روحانی تعلیمات کو عصرِ حاضر کے ذہن کے مطابق واضح کرنے کی کوشش کی اور جدید دور میں پیش آنے والے فکری چیلنجز کا سنجیدہ، معقول اور مدلل جواب فراہم کیا۔ اس طرح ان کی علمی خدمات نہ صرف اسلامی فکر کے احیاء کا ذریعہ بنیں بلکہ جدید انسان کے لیے دین کو سمجھنے کا ایک موثر اور بامعنی راستہ بھی فراہم کیا۔

مولانا کا قرآن فہمی کا انداز: مولانا وحید الدین خان کا قرآن فہمی کا انداز نہایت منفرد، سادہ اور روح پرور تھا۔ انہوں نے قرآن کی تشریح و توضیح میں غیر ضروری فقہی، کلامی، نحوی اور لفظی موشگافیوں سے حتیٰ الامکان صرفِ نظر کیا اور قرآن کے اصل پیغام کو اجاگر کرنے پر توجہ مرکوز رکھی۔ ان کے نزدیک قرآن محض ایک علمی یا بحثی کتاب نہیں بلکہ انسان کی ہدایت، تزکیہ اور معرفتِ الٰہی کا سرچشمہ ہے۔

اسی لیے مولانا نے قرآن کو تذکیر، تفکر اور تدبر کی کتاب کے طور پر پیش کیا۔ ان کی تحریروں میں قرآن ایک ایسے چشمہ حیات کی صورت میں سامنے آتا ہے جو انسان کے باطن کو بیدار کرتا، اس کی روح کو تازگی بخشتا اور اسے خدا کی معرفت سے ہمکنار کرتا ہے۔ قاری جب مولانا کی قرآنی تعبیرات کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ قرآن کے اس چشمہءحیات سے اپنی روح کو سیراب کر رہا ہو اور ربانی دسترخوان سے معرفتِ الٰہی کی غذا حاصل کر رہا ہو۔

مولانا کے نزدیک قرآن کا اصل مقصد انسان کے اندر خدا شناسی، بندگی اور آخرت کی جواب دہی کا شعور پیدا کرنا ہے۔ اسی شعور کے ذریعے انسان اپنی زندگی کا رخ خدائی ہدایت کے مطابق متعین کرتا ہے اور دنیا میں ایک مومنانہ، باوقار اور بامقصد زندگی گزارنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس طرح مولانا کی قرآنی فکر انسان کو خدا کی ابدی رضا اور آخرت کی کامیابی کی طرف سفر کرنے کا شعور عطا کرتی ہے۔

رسالت: مولانا وحید الدین خان پیغمبرِ اسلام کو پیغمبر انقلاب کے طور پر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”کوئی شخص اوپر نظر ڈالے تو اس کو ہر طرف آسمان نظر آئے گا۔ اسی طرح

انسانی زندگی میں جس طرف بھی دیکھا جائے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ وہ ساری بہترین قدریں اور اعلیٰ کامیابیاں جن کو آج اہمیت دی جاتی ہے، وہ سب آپ کے لائے ہوئے انقلاب کی براہ راست یا بالواسطہ نتائج ہیں۔''

مولانا پیغمبر انقلاب کی خصوصیات کو ان الفاظ میں لکھتے ہیں۔" مذہبی اداروں میں شخصیت پرستی کے بجائے خدا پرستی کس نے قائم کی۔ اعتقادیات کو توہمات کے بجائے حق کی بنیاد کس نے قائم کی۔ سائنس میں فطرت کی پرستش کے بجائے مسخر کرنے کا سبق کس نے دیا۔ سیاست میں نسلی شہنشاہیت کے بجائے عوامی حکومت کا راستہ کس نے دکھایا۔ علم کی دنیا میں خیال آرائی کے بجائے حقیقت نگاری کی طرح کس نے ڈالی۔ سماج کی تنظیم کے لئے ظلم کے بجائے عدل کی بنیاد کس نے فراہم کی۔ جواب یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں انسان کو پیغمبر اسلام سے ملی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کوئی نہیں جس کی طرف حقیقی طور پر ان کارناموں کو منسوب کیا جا سکے۔ دوسرے تمام افراد آپ کے انقلابی دھارے کو استعمال کرنے والے ہیں نہ کہ اس کو وجود میں لانے والے"۔

مولانا پوری تاریخ انسانیت پر نظر کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں لکھتے ہیں'' اللہ نے اپنے نبی کو تاریخ کا سب سے بڑا انسان بنا کر انسانی نسل پر اپنا سب سے بڑا احسان فرمایا۔ اس طرح معلوم تاریخ میں ایک ایسا بلند ترین مینار کھڑا کر دیا ہے کہ آدمی جس طرف بھی نظر ڈالے وہ آپ کو دیکھ لے۔ جب انسان اپنے رہنما کی تلاش میں نکلے تو اس کی نظر سب سے پہلے آپ پر پڑے۔ جب وہ حق کا راستہ جاننا چاہے تو آپ کا بلند و بالا وجود اس کو سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرے۔ آپ ساری انسانیت کے لئے ہادیء اعظم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لئے آپ کو اتنے بلند تاریخی مقام پر کھڑا کیا ہے کہ کوئی آنکھ والا جب آنکھ اٹھائے تو آپ کو دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔ مولانا نے ختم نبوت کے سلسلے میں تین قرآنی شرائط کا ذکر لکھا ہے۔ نبوت کو تاریخی مسلمہ بنانے کے لئے

آئندہ نبیوں کا سلسلہ بند کیا جائے، یہ محض اعلان نہ تھا بلکہ ختم نبوت سے پہلے ضروری تھا کہ چند شرائط لازمی طور پر ہو چکی ہوں۔

(۱)۔زندگی کے تمام معاملات کے لئے احکام خداوندی کا نزول۔(ھوالذی انزل الیکم الکتاب مفصلا)۔[القرآن]

(۲)۔انسانی کردار کے لئے ایک کامل نمونہ سامنے آئے۔(لقد کان لکم فی رسول اللہ اسو حسنہ)

(۳)۔وحی الٰہی کی دائمی حفاظت کا انتظام۔(نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون)

اللہ تعالیٰ نے اپنے فیصلہ کے ذریعے ان تینوں شرائط کی تکمیل کے انتظام فرما کر ختم نبوت پر مہر ثبت کر دی۔

سیرت اور سیرت نگاری، مطالعہ سیرت: سیرت کے عنوان سے مولانا کا جو کام رہا' اس میں دورِ جدید کی مکمل رعایت رکھی گئی یعنی سیرت کو اس طرح پیش کیا جائے جو جدید اصطلاحوں میں جدید ذہن کے لئے قابل فہم اور قابل عمل ہو۔

سیرت نگاروں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ دورِ حاضر یا ماضی قریب کے سیرت نگاروں نے جس قدر بھی سیرت پر کتابیں لکھیں' بیشتر خامیوں کے ساتھ ساتھ مقلدانہ اسلوب کو غالب رکھا گیا، جب کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ عصر حاضر میں سیرت نگاری میں مجتہدانہ اسلوب اختیار کر کے عصر حاضر کے ذہن کے لئے قابل فہم بنایا جائے۔مجتہدانہ اسلوب سے مُراد یہ ہے کہ سیرت نبوی کو از سر نو جدید اصطلاحوں میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔آج کا انسان جن اصطلاحوں میں سوچتا اور سمجھتا ہے ان اصطلاحوں میں از سر نو سیرت نبوی کی تبئین و توضیح کی جائے۔

ہمارے سیرت نگار جب سیرت کے موضوع پر لکھتے ہیں تو وہ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ بعثت سے قبل کے عرب کو تاریک اور ظلمت کدہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔اخلاقی اعتبار سے لوگ وحشی بنے ہوئے تھے۔درجنوں عورتوں سے نکاح کر کے ان کو اپنے گھر

میں رکھ لیا کرتے تھے۔لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔وغیرہ وغیرہ۔یہ لوگ سمجھتے ہیں جب تک عربوں کو آخری حد تک بُرا ثابت نہ کیا جائے پیغمبر اسلام ﷺ کی عظمت ظاہر نہیں ہوسکتی مگر یہ نہ صرف تاریخ کے خلاف ہے بلکہ قرآن اور حدیث کے بھی خلاف ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ مطالعہ سیرت کے مذکورہ اسلوب نے پورے معاملے کو غیر علمی بنادیا ہے مثلاً ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ بعثت سے پہلے عرب کے لوگ درجنوں کی تعداد میں بیویاں رکھتے تھے، دوسری طرف انہیں کتابوں میں یہ بتایا جاتا ہے کہ عرب اپنی لڑکیوں کو پیدا ہونے کے بعد مار ڈالتے تھے۔اب سوال یہ ہے کہ جس سماج میں لڑکیاں زندہ درگور ہورہی ہوں وہاں عورتیں اتنی تعداد میں کیسے پائی جائیں گی کہ لوگوں کو یہ موقع ملے کہ وہ لامحدود تعداد میں اپنے گھروں میں عورتیں رکھ لیں۔مولانا لکھتے ہیں کہ یہ استثنائی طور پر بعض عرب قبائل میں تھا، عام عرب اس کو سخت معیوب سمجھتے تھے حتیٰ کہ غریب خاندانوں کی مالی مدد کرتے تھے تاکہ وہ اس وحشیانہ رسم سے باز رہیں۔

سیرت نگاروں نے پیغمبر کی ایک تصویر اس طرح پیش کی کہ باطل سے ٹکرانا۔ اس لئے پیغمبر کی وہی تصویر اعلیٰ تصویر ہے جس میں وہ لوگوں کے ساتھ برسر جنگ نظر آئے۔اس مفروضے کی بنا پر سیرت نگاروں نے پیغمبر اسلام کو ایک لڑنے والے پیغمبر کے روپ میں پیش کیا جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔پیغمبر اسلام کو خدا نے رحمت عالم بنا کر معبوث کیا۔یہی وجہ ہیکہ مولانا نے سیرت نگاری کا جو اسلوب اختیار کیا وہ صرف اور صرف علمی معیار پر جدید ذہن کی رعایت کرتے ہوئے اس کی مکمل مطابقت رکھتا ہے۔

جدید ذہن کیا ہے؟ جدید ذہن سے مُراد ایسا سائنٹفک علمی ذہن، علمی تحقیق اور دلائل کے اسلوب میں علمی بنیادوں پر کسی چیز کو اپنانے یا رد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔مولانا نے قدیم روایتی اور عقیدت مندانہ اسلوب کو نظر انداز کرتے ہوئے اسلامی تعبیرات کو اس طرح پیش کیا جو عصر حاضر کے اس خلا کو پُر کرسکے۔یقیناً وہ دورِ جدید میں جدید

اصطلاحوں میں اپنے مذہبی نقطہ نظر کو پیش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تاریخ کی ایک استثنائی شخصیت ہیں، آپ واحد انسان ہیں جن کی زندگی میں انسانیتِ اعلیٰ کے تمام پہلو کامل صورت میں جمع ہو گئے۔ آپ کی زندگی کا مطالعہ گویا کامل انسانیت کا مطالعہ ہے۔ یہی بات قرآن میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے۔ انک لعلی خلق عظیم۔

سیرت رسول ایک جامع قسم کی انسانی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ وہ نہ صرف حیات بشری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے ہے بلکہ مختلف زمانوں کی رعایت بھی اس میں کمال درجے میں پائی جاتی ہے۔ رسول کی زندگی میں بلاشبہ حیات بشری کے لئے کامل نمونہ ہے۔ مگر اس نمونے کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ سمجھنے کے لئے وہ شخصیت درکار ہے جس کی معرفت اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ ایک خدا ہی اس کی تمام توجہات کا مرکز بن جائے۔ وہ زندگی کی حقیقت سے اتنا زیادہ باخبر ہو جائے کہ آخرت کے سوا ہر چیز اس کو بے حقیقت نظر آنے لگے۔ وہ معرفت کی اس سطح پر پہنچا ہوا ہو کہ اللہ کی یاد ہی اس کی سب سے دینی سرگرمی بن جائے۔ جب آدمی روحانی بلندی یا شعوری ارتقاء کے اس درجے تک پہنچتا ہے تو وہ آخری حد تک حقیقت شناس بن جاتا ہے۔ اور ایک سچّا حقیقت شناس ہی سیرت کو اس کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ آدمی حقیقت شناسی کے جس مرتبے پر ہوگا اس کے بقدر وہ سیرت کے رموز سمجھنے میں کامیاب ہوگا۔ سیرت کا مطالعہ گویا معرفت کے سمندر میں غواصی ہے۔ غواصی کا یہ عمل قیامت تک جاری رہے گا۔ لوگ اپنی اپنی ہمت کے مطابق ہمیشہ اس سے نئے نئے موتی نکالیں گے۔ ہر دور کے انسان اس خزانہ سے مالا مال ہوتے رہیں گے۔ وہ کبھی کسی کے لئے خالی ہونے والا نہیں ہے۔

(دین انسانیت)

تاریخ: تاریخی نکات سے عبرت و نتائج اخذ کرنے کا جو طریقہ مولانا کا ہے وہ قدیم و جدید مورخین سے بالکل الگ ہے۔ مولانا نے اسباق تاریخ کے شروع کے صفحہ میں لکھا ہے کہ

قدیم زمانے میں تاریخ کو زیادہ تر جنگ وفتوحات اور داستان کے طور پر لکھا جاتا تھا۔ یہی انداز ساری دنیا میں پھیل گیا۔ یہی مروّجہ انداز مسلمانوں میں بھی غیر شعوری طور پر داخل ہو گیا۔

اسلام کے ظہور کے بعد ہزار سال تک اسلام کی تاریخ پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں مگر وہ زیادہ تر فتوحات مسلمین، جنگ نامہ اسلام یا اسلامی فتوحات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پہلا شخص جس نے اسلامی تاریخ کی اس کمی کو محسوس کیا' وہ عبدالرحمن ابن خلدون تھا۔ اس نے نئے اسلوب پر تاریخ نگاری کے اصول وضع کئے جو اس کی مشہور کتاب" مقدمہ" میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ اسلام شمشیری مذہب ہے جب کہ اسلامی تاریخ بالکل اس کے برعکس ہے۔ اسلام تاریخ وسیع تر معنوں میں حیات انسانی کی تاریخ ہے۔ اسلام نے تاریخ میں کروڑوں انسانوں کو متاثر کیا اور زندگی کے تمام شعبوں میں نیا انقلاب پیدا کیا۔

تاریخ اسلام کے اوّل دن سے دورِ حاضر تک جتنے بھی حیات انسانی اور انسانی تاریخ میں انقلاب آئے جس سے جدید تہذیبی اور سائنسی انکشافات وجود میں آئیں۔ حقیقتاً یہ مذہب اسلام کی دین ہے۔ کسی سائل کے سوال کے جواب میں مولانا نے کہا تھا جب سائل نے کہا کہ اگر تاریخ سے اسلام کو الگ کر دیا جائے تو تاریخ پر کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ جواب میں مولانا نے کہا وہی فرق پڑے گا جو اسلام سے پہلے تھا۔ یعنی اسلام سے پہلے جو تاریکی تھی وہ بدستور قائم رہے گی۔ مولانا نے جس تاریخ کو اسلام کے مثبت اور منفی پہلو نکالنے کا جو اسلوب اختیار کیا، چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے نتائج اخذ کرنے اور ان کو دورِ حاضر پر منطبق کر کے ان سے انسانیت کے لئے مثبت ومنفی پہلو نکال کر بیداری اور شعور واحساسات کو تقویت بخشی یہ مولانا ہی کا خاصہ ہے۔ تاریخی واقعات سے نتائج اخذ کرنا اور اس سے سبق آموز نکات نکال کر حال اور مستقبل کے لئے راہِ عمل متعین کرنا، یہ شعور مولانا کی کتابوں سے کامل طور پر اخذ کر کے اور ان سے استفادہ کیا

جاسکتا ہے۔

دعوت الی اللہ: مولانا وحید الدین خان کی تمام کتابوں کا نچوڑ اگر نکالا جائے تو مختصر الفاظ میں معرفت الٰہی اور دعوت الی اللہ کو ترک کرنا ہے۔ یہی دو چیزیں ان کی تمام کتابوں کا نچوڑ ہیں۔ مولانا کا ماننا ہے کہ مسلمانوں میں دور حاضر میں جس قدر پستی آئی ہے، اقوام عالم میں دوسرے درجہ کی قوم بنتی جارہی ہے۔ اس کی اصل وجہ دعوت الی اللہ ہے۔ دور اوّل کے مسلمانوں کو جو عالمی فتح ونصرت ملی اس کا راز دعوت الی اللہ تھی۔ انہوں نے اپنے ہر کام کے ساتھ دعوتِ الی اللہ کو جوڑا تو اقوام عالم ان کے زیر نگین ہو گیا۔

مولانا اپنی کتاب دور دعوت میں لکھتے ہیں ظہور اسلام کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک جو بھی تاریخ اسلام پر کتابیں لکھی گئیں، وہ سیاسی پیٹرن پر لکھی گئیں۔ مجموعی طور پر ان میں باقی تمام ابواب تو موجود تھے لیکن ان مجموعہ تاریخ میں جس موضوعات اور ابواب کی کمی رہ گئی ہے وہ دعوت الی اللہ کی کمی ہے۔

عباسی دور سے لے کر دورِ حاضر تک اسلامی موضوعات پر تحریری کام بڑے پیمانے پر ہوا۔ پہلے اور اب کے پیٹرن میں عملی طور پر کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ پہلے بھی فتوحاتی اور غزواتی پیٹرن پر کتابیں لکھی گئیں اور اب بھی اسی پیٹرن پر لکھی جارہی ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ کہ پیغمبر اسلام کی تاریخ کو غزواتی اور فتوحاتی پیٹرن پر لکھا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پیٹرن ایک مقبول ترین پیٹرن تھا۔ اسی زمانی عنصر کی بنا پر اسلامی تاریخ کو بھی اسی رُخ پر پیش کیا گیا۔ دعوتی پیٹرن کو حذف کے درجہ تک غائب کیا گیا۔ مولانا کتاب ''الاسلام'' کے صفحہ نمبر 173 پر لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کو آج اہل عالم کے سامنے وہی فریضہ انجام دینا ہے جو رسول اللہ نے اپنے زمانے کے لوگوں کے اوپر انجام دیا تھا۔ یعنی قرآن کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانا۔ جس طرح زکوٰۃ کی ادائیگی کے بغیر سارا مال ایک مسلمان کے لئے حرام رہتا ہے، اسی طرح اس (دعوت الی اللہ) کے فریضے کو انجام دینے سے پہلے ہمارے لئے جائز نہیں ہے کہ

ہماری زندگی میں کسی اور چیز کا حصہ ہو۔ ہمارے لئے کوئی خوشی اس وقت تک خوشی نہیں ،کوئی عافیت اس وقت تک عافیت نہیں جب تک ہم پیغام رسانی کے اس کام کو انجام نہ دے لیں۔ یا کم از کم اپنے آپ کو اس میں لگائے ہوئے نہ ہوں۔

مختصر طور پر کرنے کے کام:

(۱)۔ہمیں قرآن کا ترجمہ بہترین اہتمام کے ساتھ، دنیا کی تمام زبانوں میں فراہم کرنا ہے۔

(۲)۔رسول اور اصحابِ رسول کی زندگیوں پر جدید اسلوب میں کتابیں تیار کر کے تمام دنیا کے لوگوں تک پہنچانا ہے۔

(۳)۔پیغمبر کے اقوال احوال حدیث (یعنی سیرت کو عصر حاضر کے اسلوب میں) ترجمے کر کے تمام زبانوں میں تیار کرنا ہے۔

(۴)۔اسلام کی تاریخ (نہ کہ فتوحات کی تاریخ) مرتب کر کے شائع کرنا ہے۔

(۵)۔جدید زبان اور عصری اسلوب میں اسلام کو مدلل کرنا ہے۔

(۶)۔وہ تمام عملی تدبیریں اختیار کرنا اور معاون ادارے قائم کرنا ہے جو کسی دعوت کو موثر انداز میں لوگوں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دعوت الیٰ اللہ کا پہلو ہی مولانا کی زندگی کا خلاصہ ہے۔ان کے نزدیک دعوت کا نشانہ یہ ہے کہ آدمی دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی مخلوق بن جائے۔ وہ دنیا کی عظمتوں میں خدا کو دریافت کرے۔ وہ دنیا کی نعمتوں میں جنت کی نعمتوں کا تجربہ کرنے لگے۔دنیا کی تکلیفیں اس کو جہنم کی تکلیف یاد دلائیں۔دنیا کے مناظر اس کو آخرت کی حقیقتوں کا مشاہدہ کرانے لگیں۔ یہی دعوت کا نشانہ ہے اور ایسے ہی انسانوں کو وجود میں لانا دعوت اور داعی کی کامیابی ہے۔

آج کا انسان جدید مادیت سے اُکتا چکا ہے۔ وہ مادیت کی ظاہری رونقوں سے اُکتا کر روحانی سکون کی تلاش میں ہے۔اسی حالت میں لازمی ہے کہ انسان کے

سامنے اسلام کی روحانیت کو اس انداز سے بیان کیا جائے جسے رَبانیت کا گلدستہ ہو۔ آج کا انسان مذہب امن کی تلاش میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا انسان اسلام کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف اسلام کا طالب ہے۔ دعوت کے عمل کو اگر درست طور پر انجام دیا جائے تو بیشتر انسان اسلام کو اپنے دل کی آواز پائیں گے اور جدید تاریخ میں وہ منظر سامنے آجائے گا جس کی تصویر کشی قرآن میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ اِذَا جَاءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ۔

اس لئے ایسے حالات میں امت کے حساس طبقے کے لئے لازم ہے کہ وہ اس حساس ترین معاملے کے لئے اپنی دنیوی مقبولیت کی قیمت ادا کر کے دین کی اس کے اصلی روپ میں اصلاحی کوششیں شروع کریں۔ امت میں جب تک یہ اپنی مقبولیت کی قیمت آخری حد تک ادا نہ کی جائے اس وقت تک دین پر سے بے دینی کا گرد وغبار ہٹانا از حد مشکل ہے۔

تجدید کا دوسرا پہلو حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ یَبۡعَثُ لِہٰذِہِ الۡاُمَّۃِ عَلٰی رَاسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنۡ یُجَدِّدُ لَہَا دِیۡنَہَا۔ [ترجمہ۔ بے شک اللہ اس امت کے لیے ہر سو سال کے سرے پر کسی ایسے شخص کو بھیجتا ہے جو اس کے دین کی تجدید (نئی تازگی اور اصلاح) کرے۔] (سنن ابی داؤد)

مولانا اس حدیث کی روشنی میں کہتے ہیں یہ کوئی پُر اسرار بات نہیں ہے۔ یہ فطری قانون کے تحت پیش آنے والا معاملہ ہے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کی عمر محدود ہے۔ وہ سو سال سے پہلے مَر جاتا ہے۔ اس طرح ایک نسل کے بعد دوسری آتی رہتی ہے۔ ایک تیار شدہ نسل ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک غیر تیار شدہ نسل پیدا ہو کر ان کی جگہ لیتی ہے۔ ضرورت ہوتی ہے کہ جس طرح پہلی نسل کو تیار کیا گیا تھا، اسی طرح دوسری اگلی نسلوں کو تیار کیا جائے۔ زوال کا مذکورہ عمل ایک مسلسل عمل ہے اور اسی کو انحطاط کہا جاتا تجدید اسی صورت حال کی اصلاح ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کے بعد امت پر جب زوال کا دور آیا تو بار بار مجددین اسلام پیدا ہوتے رہے۔ مثلاً عمر بن عبدالعزیز، اموی (وفات 720)، ابن تیمیہ الحرانی (وفات 1328)، شاہ ولی اللہ دہلوی (وفات 1762)، وغیرہ۔ یہ لوگ مسلّمہ طور پر مجدد تھے، انہوں نے اپنے زمانے کے لحاظ سے تجدیدی کام کیا۔

امن، سائنسی دور اور ڈائیلاگ مولانا وحید الدین خان کی فکر امتِ مسلمہ کی تاریخ کو عمومی طور پر دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ روایتی دور اور سائنسی دور۔ پچھلی صدیوں میں جو محدثین اور علماء پیدا ہوئے وہ زیادہ تر روایتی دور سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے روایت کے دائرے میں رہتے ہوئے دین کی تشریح اور تدوین کا عظیم کام انجام دیا اور اسلامی علوم کو محفوظ کیا۔

موجودہ زمانہ ایک نیا دور ہے جسے سائنسی دور کہا جاتا ہے۔ اس دور کے مسائل اور تقاضے پہلے زمانوں سے مختلف ہیں۔ سائنسی تحقیقات نے انسان کے سامنے کائنات کے بہت سے راز کھول دیے ہیں۔ آج انسان کائنات، فطرت اور انسانی وجود کے بارے میں نئے انداز سے سوچ رہا ہے۔ ایسے حالات میں ضرورت ہے کہ قرآن کے علوم کو جدید سائنسی تناظر میں سمجھا جائے اور ان کو اس انداز میں پیش کیا جائے جو موجودہ دور کے انسان کے لیے قابلِ فہم ہو۔

قرآنِ مجید میں آفاق اور انفس کی جن نشانیوں کے ظاہر ہونے کی خبر دی گئی تھی، وہ آج سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں واضح ہوتی جا رہی ہیں۔ جدید سائنسی دریافتیں دراصل قرآن کی صداقت کی گواہی دے رہی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان نئی دریافتوں کو قرآن کی تعلیمات کے ساتھ مربوط کر کے پیش کیا جائے تاکہ جدید انسان کو دین کی حقانیت زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آ سکے۔

امن اور تشدد: پیغمبر اسلام کی تعلیمات میں سب سے نمایاں چیز امن اور مثبت سوچ ہے۔ اسلام ہر ممکن طور پر جنگ کو ٹالنے اور امن کو قائم کرنے پر زور دیتا ہے۔ اگر کبھی اضطراری

صورت میں جنگ کی نوبت آجائے تو مسلمانوں کی پہلی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ جنگ کے ماحول کو ختم کر کے امن کا ماحول قائم کیا جائے، تاکہ انسان دعوتِ دین اور اصلاحِ معاشرہ کے کاموں میں مصروف ہو سکے۔

امن پسند انسان سچائی پر قائم ہوتا ہے، جبکہ تشدد پسند انسان اکثر جھوٹ اور جذبات کے زیرِ اثر عمل کرتا ہے۔ امن کا راستہ ابتداء سے انتہا تک کھلا اور آسان ہوتا ہے، جبکہ تشدد کا راستہ رکاوٹوں اور مشکلات سے بھرا ہوتا ہے۔

امن میں تعمیر ہی تعمیر ہوتی ہے اور تشدد میں تخریب ہی تخریب۔ امن پسند انسان دوسروں کی محبت میں جیتا ہے، جبکہ تشدد پسند انسان دوسروں کی نفرت میں۔ اسی لیے امن پسند انسان کا انجام کامیابی اور ترقی ہوتا ہے، جبکہ تشدد پسند انسان کا انجام شرمندگی اور ناکامی پر ہوتا ہے۔

پیغمبر اسلام انتہائی حد تک ایک امن پسند انسان تھے، آپ کے مخالفین نے بار بار آپ کو لڑائی میں الجھانا چاہا مگر آپ اعراض کر کے لڑائی سے بچتے رہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عین اس وقت جب دونوں طرف فوجیں آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ پیغمبر اسلام کے پاس خدا کا فرشتہ آیا، اس نے کہا کہ اے محمد اللہ نے آپ کو سلام (سلامتی پیغام) بھیجا ہے۔ یہ سن کر پیغمبر اسلام نے فرمایا ھوالسلام، ومنہ السلام، ولیہ السلام البدایہ والنہایہ یعنی اللہ سلامتی ہے اور اس سے سلامتی ہے۔ اور اسی کی طرف سلامتی ہے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عین لڑائی کے وقت بھی پیغمبر اسلام ایک امن پسند انسان بنے ہوئے تھے۔ اس ہنگامی وقت میں بھی ایسا نہ تھا کہ آپ کا ذہن نفرت اور تشدد سے بھر جائے بلکہ اس وقت بھی امن اور سلامتی کی اصطلاحوں میں سوچتے تھے۔ اس وقت بھی آپ کا دل اس آرزو سے تڑپتا رہا کہ اللہ کی مدد سے وہ دنیا میں امن سوچے۔ جو لڑائی کے غموں میں بھی سلامتی کا جذبہ اپنے دل میں لئے ہوئے ہو، یہ کوئی سادہ بات نہیں ہے اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ مثبت سوچ کی اعلیٰ ترین مثال ہے جیسا کہ معلوم ہے جنگ تمام منفی واقعات

میں سب سے بڑا منفی واقع ہے۔ پیغمبر اس کے کنارے کھڑا ہوا ہے مگر اس کی زبان سے خون اور تشدد کے بجائے امن اور سلامتی کے الفاظ نکل رہے ہیں۔ یہ بلاشبہ اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے۔ اعلیٰ انسان وہ ہے جو تشدد کے درمیان بھی امن کی بات سوچے۔ جو جنگ کے حالات میں بھی صلح کا منصوبہ بنائے۔ (امن عالم)

صلح حدیبیہ، امن کا مثالی نمونہ: مولانا وحید الدین خان انسانی امن اور عالمی دعوت کے لیے صلح حدیبیہ کو ایک مثالی نمونہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک صلح حدیبیہ قیامت تک مسلمانوں کے لیے ایک آئیڈیل ہے۔ اس معاہدے میں امن کی خاطر دشمن کی بہت سی سخت اور بظاہر ناموافق شرائط کو بھی قبول کیا گیا۔

قرآنِ مجید میں ارشاد ہے الصلح خیر (النساء 128) یعنی صلح کا طریقہ بہتر اور مفید ہے۔ صلح حدیبیہ بظاہر ایک سادہ معاہدہ تھا، مگر حقیقت میں وہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک عظیم فتح ثابت ہوا۔ اس کے بعد دعوتِ اسلام کے دروازے کھل گئے اور لوگ بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہونے لگے۔ یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ امن ایک منصوبہ بند اور دانشمندانہ عمل ہے، جبکہ تشدد زیادہ تر جذباتی ردِّ عمل ہوتا ہے۔ امن پسند انسان پہلے سوچتا ہے اور پھر عمل کرتا ہے، جبکہ تشدد پسند انسان پہلے عمل کر بیٹھتا ہے اور بعد میں سوچتا ہے۔ پر امن عمل کی ابتداء بھی امید سے ہوتی ہے اور اس کا انجام بھی امید پر ہوتا ہے، جبکہ پر تشدد عمل کی ابتداء تو فرضی امید سے ہوتی ہے مگر اس کا انجام اکثر مایوسی اور نقصان پر ہوتا ہے۔

ڈائیلاگ کی اہمیت: مولانا وحید الدین خان مناظرہ بازی کے سخت مخالف تھے۔ ان کے نزدیک مناظرہ بازی میں مثبت نتائج پیدا نہیں ہوتے کیونکہ اس کا مقصد ہار اور جیت ہوتا ہے۔ کوئی بھی فریق ہارنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، اس لیے مناظرہ اکثر باہمی نفرت اور دشمنی کا سبب بن جاتا ہے۔ مولانا کے مطابق ہندوستان جیسے کثیر المذاہب معاشرے میں مسائل کا حل ڈائیلاگ کے ذریعے ممکن ہے۔ اس ڈائیلاگ میں ضروری ہے کہ دونوں

فریق کھلے دل کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے اپنی بات رکھیں اور باہمی مشورے سے مسائل کا حل تلاش کریں۔ مولانا اس ڈائیلاگ کو صلح حدیبیہ کی سنت کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ ڈائیلاگ کیا جائے تو وہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نیا باب ثابت ہوسکتا ہے۔ ڈائیلاگ کوئی حریفانہ مقابلہ نہیں بلکہ ایک برادرانہ نشست ہے۔ اس کا مقصد مسئلے کو سلجھانا ہے، نہ کہ اسے مزید پیچیدہ بنانا۔ اگر دونوں فریق وسیع تر قومی مفاد کو سامنے رکھ کر بات کریں تو یہ طریقہ ملک اور قوم کے لیے فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے۔

امن کائنات کا فطری نظام: امن دراصل پوری کائنات کی بنیادی حقیقت ہے۔ کائنات کا نظام ہزاروں لاکھوں سال سے امن اور توازن کے اصول پر قائم ہے۔ حیوانات، نباتات اور جمادات سب ایک منظم اور پُرامن نظام کے تحت چل رہے ہیں۔ اگر کائنات کے اس نظام میں تصادم اور ٹکراؤ پیدا ہوجائے تو پورا نظام درہم برہم ہوجائے۔ اسی طرح انسان کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ کائنات کے اس فطری اصول کے مطابق امن کو اپنائے۔ مولانا وحیدالدین خان کے مطابق:

- جنگ تخریب ہے اور امن تعمیر۔
- جنگ فطرت کے نقشے کے خلاف ہے اور امن فطرت کے مطابق۔
- جنگ کی تاریخ بربادی کی تاریخ ہے اور امن کی تاریخ ترقی اور آبادی کی تاریخ ہے۔

اسی لیے امن کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اسے حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی قیمت زیادہ نہیں سمجھی جاتی۔

فکر اور عمل کا تعلق: انسان کے اعمال کی درستگی ہمیشہ اس کی فکر کی درستگی پر منحصر ہوتی ہے۔ جب انسان کی سوچ درست ہوتی ہے تو اس کے اعمال بھی درست ہوجاتے ہیں۔ اسلام اسی لیے انسان کی فکر کی اصلاح پر زور دیتا ہے تاکہ اس کے اعمال بھی درست راستے پر چل سکیں۔

معرفتِ الٰہی: حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی زندگی کا ماحصل کوئی چیز ہے تو وہ توحید اور معرفتِ رب ہے۔ان کی تحریک کے اکثر حصہء تحریرات کا خلاصہ اگر پیش کرنا ہوتو وہ توحیدِ باری تعالیٰ ،معرفت حق اور احتساب نفس پر مشتمل ہے۔جس چیز کو صوفیاء معرفت کہتے ہیں' مجموعی طور پر مولانا اس طرز معرفت سے اختلاف رکھتے ہیں۔مولانا نے معرفت روحانیت اور تذکیہ نفس کے جو اصول بنائے ہیں وہ تمام تر سائنٹفک انداز میں ہیں۔مولانا کے ہاں معرفت مبنی بر مشاہدہ ہے۔الرسالہ کی تحریریں اور ان کی دیگر کتب توحید اور معرفت رب کی ایسی مشاہداتی عکاسی کرتی ہیں جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے معرفت کو مشاہداتی اخذ کیا ہے۔مولانا نے روایتی تعلیمی سفر کے بعد معرفت ربانی کے حصول کی داستان یوں بیان کی ہے''مذہب کا روایتی ڈھانچہ میرے لئے بے اطمینانی ،مرے لئے خود مذہب سے مستقل انحراف اور بغاوت کا سبب بن گیا تھا جیسا کہ اس دور کے بہت دوسرے افراد کے ساتھ پیش آیا مگر اللہ کا خاص فضل ہے کہ میری بے اطمینانی بہت جلد تلاشِ حق میں تبدیل ہوگئی ، میری اندرونی بے چینی مکمل طور پر تلاشِ حق اور جستجو کے رخ پر پڑ گئی۔اگر کوئی شخص میرے اس زمانے کے صبح وشام کو دیکھ سکے تو وہ پائے گا کہ میں کبھی اعظم گڑھ کی جامع مسجد کی صحن میں پیپتا کے درخت کے نیچے کھڑا ہوں اور میری آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری ہیں اور زبان سے بے تابانہ طور پر یہ الفاظ نکل رہے ہیں خداوندتُو کب آئے گا ؟ میں کب تک تیرے آنے کا انتظار کروں؟ اسی طرح وہ دیکھے گا کہ لاہور میں میو روڈ کے کنارے ایک کھمبے کے سہارے اور وہاں پر یہ حالت ہے کہ آنکھوں سے انسو جاری ہیں' اور زبان پر یہ الفاظ ہیں خداوندتُو کب آئے گا ؟ میں کب تک تیرا انتظار کروں؟ کبھی جنگلوں میں پیدل جارہا ہوں ، پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے ہیں۔حلق خشک ہورہا ہے، زبان پر جاری ہے خداوند تو کب آئیگا ؟ کب تک تیرا انتظار کروں؟۔مولانا اپنے تلاشِ حق کی جستجو کے بارے میں کہتے ہیں کہ جس تلاش حق کے معرفت کے لئے میں سرگرداں تھا، بنارس کی ایک مسجد میں

مغرب کے وقت جماعت میں شریک ہوا، امام نے جب یہ آیت نماز میں پڑھی ''اَلَم یَجِدکَ یَتِیمًا فَاٰوٰی۔ وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی۔ وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغنٰی''۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ خدا ان آیتوں کے ذریعے براہ راست طور پر مجھ سے مخاطب ہے وہ میرے سوال کا جواب دے رہا ہے۔ ان آیتوں کو سن کر مجھے سکون حاصل ہوا۔ اس کی ٹھنڈک میں آج تک محسوس کر رہا ہوں۔'' (ڈائری، 31 اکتوبر 2020)

مولانا کہتے ہیں سچائی کو میں نے دریافت کی سپرٹ سے اس وقت پایا جب 1948ء میں رات کا وقت تھا اور میں اعظم گڑھ کی جامع مسجد میں تھا، وہاں دیگر افراد بھی موجود تھے، دریافت کی حد تک سچائی کا انکشاف مجھ پر ہوا تو اسی مسجد میں ماسٹر عبدالحکیم انصاری کے سامنے کلمہء شہادت ادا کیا اور شدتِ تاثر سے بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ (اوراقِ حیات)

درجہ بالا سطور سے واضح ہوا کہ مولانا روایتی اسلام سے بالاتر دریافت کی سطح پر معرفت اسلام کو حاصل کرنا چاہتے تھے، مولانا کی تمام تحریروں سے اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ انہی تاثرات کو مولانا وحید الدین خان نے اپنی کتاب ''کتابِ معرفت'' میں اس طرح بیان کیا ہے۔ ''معرفت دین کا خلاصہ ہے، معرفت دین کا آغاز ہے، معرفت دین کا اختتام ہے، دینِ خداوندی میں معرفت کی حیثیت بیج کی ہے۔ جس طرح ایک بیج سے پورا درخت بنتا ہے، اسی طرح معرفت سے انسان کی ساری زندگی تشکیل پاتی ہے۔ معرفت کے بغیر دین صرف بے روح فارم بن جاتا ہے۔ معرفت کے ساتھ دین گویا ایک ہرا بھرا درخت ہے اور معرفت کے بغیر دین صرف ایک سوکھا درخت ہے۔ دین اگر جسم ہے تو معرفت اس کی روح ہے۔ معرفت سے مراد معرفتِ حق ہے۔ حقِ معرفت ایک شعوری دریافت ہے۔ حقِ معرفت کسی قسم کی پُراسرار کیفیت کا نام نہیں۔ معرفت کسی انسان کو اندھیرے میں نہیں ملتی بلکہ معرفت کسی انسان کو اجالے میں ملتی ہے۔ معرفت کے حصول کا ذریعہ مراقبہ نہیں۔ معرفت کے حصول کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ غور و فکر

ہے۔معرفت کوئی وجد کی نوعیت کی چیز نہیں ،معرفت تمام تر شعوری واقعہ ہے ، نہ کہ کوئی مجہول واقعہ۔معرفت کا آغاز روحِ تجسّس سے ہوتا ہے،تلاش ایک ذہنی سفر ہے اگر آدمی کے اندر سنجیدگی ہو،اگر وہ اپنی تلاش کے معاملے میں حقیقی طور پر دیانتدار ہو،اگر اس کے اندر منفی سوچ نہ پائی جاتی ہو،اگر وہ تعصّبات سے پوری طرح خالی ہو،اگر پورے معنوں میں نفسیاتی پیچیدگیوں سے پاک روح بن چکا ہو تو اس کے لئے معرفت کا حصول اتنا ہی زیادہ یقینی بن جاتا ہے جتنا سورج نکلنے کے بعد روشنی کا ظہور میں آنا۔

معرفت کے حصول کے لئے ایک لازمی شرط دعا ہے۔معرفت کا معاملہ دوطرفہ معاملہ ہے۔انسان کی حیثیت معرفت پانے والے کی ہے اور اللہ کی حیثیت معرفت عطا کرنے والے کی ہے۔یہ ففٹی ففٹی کا معاملہ ہے۔خدا کی مدد کے بغیر انسان کو معرفت نہیں مل سکتی۔انسان کی ہر کوشش اس وقت تک بے نتیجہ رہے گی جب تک خدا کی مدد اس کے ساتھ شامل نہ ہو جائے۔دعا کوئی مجموعہ الفاظ دہرانے کا نہیں ، دعا در حقیقت دل کی تڑپ کا نام ہے۔دعا داخلی طوفان کا خارجہ اظہار ہے،اس لئے معرفت کے بغیر اسلام نہیں اور دعا کے بغیر معرفت نہیں۔(کتابِ معرفت)

☆☆☆

Maulana Wahiduddin Khan ka Munfarid Fikri Usloob Ahd-e-Hazir mein

by Dr. Ziyaurrahman (Himalayan Degree college, Rajouri)
ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن (ہمالین ڈگری کالج، راجوری)

مولانا وحید الدین خان کا منفرد فکری اور عصری اسلوب عہدِ حاضر میں

دْنیا میں فِکر اسلامی اور عصری اسلوب میں لکھنے والے لوگ ہر دور میں رہے ہیں اور اپنی اپنی فہم کے مطابق ہر ایک نے یہ کوشش کی کہ وہ اسلام کی تعبیرِ جدید عصری اسلوب کے ساتھ پیش کرے اور قرآن وسنت کے حوالے سے بات کرے، مگر کیا اس کی تحریریں واقعی اسلامی مزاج کے مطابق تھیں اور اسوہ رسول کے قریب تھیں؟ اور کیا خدا کے تمام ادیان وپیغمبر ورسل کی تعلیمات سے قریب تر تھیں، اسلام دین فطرت کے مطابق ہے۔ کیا فطرت کے تقاضوں کے مطابق لکھنے والے لوگ نظر آتے ہیں یا اپنے اپنے خول، مسلکی، علاقائی انداز میں فکرِ اسلامی کی تعبیر وتشریح کرنے والے حضرات کی بہتات ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو ذہنوں میں ابھرتے رہتے ہیں اور ہر وہ ذہن جو فکر اسلامی کی تلاش میں سرگراں ہے اس کا دماغ تحلیل وتجزیہ کی حالت میں ہوتا ہے۔

دورِ حاضر میں فکر اسلامی کے حوالے سے بہت بڑے بڑے صاحب قلم، اربابِ بصیرت اور صاحبِ فکر ونظر حضرات پیدا ہوئے، جنہوں نے اپنی علمی بصیرت کے مطابق جلیل القدر کام کئے۔ ان ہی لوگوں میں ایک نام ہے مولانا وحید الدین خان' جو عصر حاضر کے عالمی لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ فِکر اسلامی کی تعبیر جدید کے حوالے سے پوری دنیا میں مشہور ومعروف ہیں۔ انہوں نے عصری اسلوب میں فکر اسلامی کی جو تشریح کی ہے وہ بالکل انوکھی اور منفرد ہے اور اسلامی مزاج سے مطابقت رکھتی ہے۔ جس انداز میں

انہوں نے پوری اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفہ، مزاج دین، قرآن وحدیث اور عہد نبوی کا محاکمہ کیا، وہ پڑھنے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی ہی فکر اسلامی کو سمجھنے میں گزار دی۔ اسلام کے ہر پہلو پر انہوں نے کام کیا اور بہت گہرائی کے ساتھ ہر بات کو پیش کیا۔ ہم نے دیکھا کہ ان کے یہاں تجزیہ اور تفکیر بہت زیادہ ہے ساتھ میں خشیت اتنی ہے کہ ہر چیز کو وہ آخرت اور خوفِ خدا سے جوڑ دیتے ہیں اور اشکبار کر جاتے ہیں۔ خدا کی عظمت اور کبریائی کا اظہار ایسے اسلوب میں کرتے ہیں کہ مولانا کو پڑھنے والا انسان اپنے اردگرد خدائی عظمت وسطوت اور اس کی جبروتیت کو محسوس کرنے لگتا ہے۔

عصر حاضر میں مولانا وحید الدین خان کا علمی، معرفتی اور فکری درک جس معیار پر قائم تھا وہ ہمیں معاصر علماء میں نظر نہیں آیا۔ وہ اپنے عہد کے عقبری ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم تر مفکر اور داعی ء بے مثل تھے، ظاہر اور باطن کی یکسانیت میں لاثانی تھے۔ ان کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ وہ ملہم من اللہ ہیں (یعنی خدا کی جانب سے ان پر حقائق اور بصیرتوں کا الہام ہو رہا ہے)۔ مولانا کی دور بیں آنکھ بہت روشن تھی، وہ سینکڑوں سالوں کی عبقری شخصیات میں سے ایک تھے۔ نہ صرف عہد حاضر میں بلکہ گزشتہ کئی صدیوں میں ایسا جامع الکمالات انسان نہیں ملا۔ انہوں نے ہزاروں ہزار راتیں اور اسی طرح کے ایام معرفت الٰہی کی تلاش میں لگائے تھے، سخت ترین، صبر از مار حلوں سے خود کو گزارا اور اس راہ میں آنے والے مصائب والام کو زندگی کا حصہ مان کر چلتے رہے، مسلسل آخری سانس تک علم ومعرفت کی غواصی میں لگے رہے۔ ابتدائے عمر سے لے کر انتہائے عمر تک پوری سرگرمی اور جانفشانی کے ساتھ خدائی آیات وانفس، کائنات اور ماورائے کائنات میں غور وخوض کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب انہیں شرح صدر ہو گیا کہ یہی حق ہے اور سچ کی گواہی ہے تو انہوں نے اپنے قلم اور زبان سے وہ باتیں عصری اسلوب میں لکھ دیں یا کہہ دیں جو آج ہمیں ان کی کتابوں، مضامین اور گفتگوؤں میں علم وحکمت اور معرفت کی

شکل میں نظر آتیں ہیں۔

ایسے دور میں جب اکابرینِ اُمت اور حاملینِ اسلام ظاہری پردے میں اشیاء کی حقائق پر گفتگو کر رہے تھے تو مولانا اس کے مخفی پردوں سے پرتیں اٹھا رہے تھے اور حکمت ومعرفت کے گوہر بکھیر رہے تھے۔ ''الرسالہ'' کی ایک پیج کی تحریر ہزاروں صفحات پر بھاری پڑتی تھی۔ مولانا نے حکمت ومعرفت، حقانیتِ اسلام، عقلیاتِ اسلام، امن وسلامتی اور دعوت کے موضوع پر سینکڑوں کی تعداد میں کتابیں لکھیں۔ ان تمام کتابوں میں مولانا کا انداز بہت منفرد ہے۔ وہ کبھی بھی جذبات، طیش یا غضب میں اکر گفتگو یا کلام نہیں کرتے اور نہ ہی یہ چیزیں ان کی تحریروں میں ملتی ہیں۔ وہ ہمیشہ سائنٹفک اسلوب اور پُر وقار انداز میں لکھتے اور بولتے تھے۔ ان کی تحریروں میں جو حسن ہے وہ نادر الوقوع ہے، تحریریں سادگی کے باوجود پُر کیف اور سلیس الاداء ہیں اور ادب کا شاہکار ہیں اور سب سے بڑھ کر حکمت ومعرفت سے لبریز ہیں۔ وہ جس سوچ پر عہد جوانی میں قائم تھے یا یوں کہہ لیں کہ جس فکر کو انہوں نے عہد جوانی میں تراشا تھا اسی پر آخری عمر تک قائم تھے۔ مولانا کا فکری شعور بہت بالغ تھا، وہ ہر چیز کو دلائل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے اور سائنٹفک اصول اپناتے تھے، نقد وجرح میں کسی کی پرواہ نہیں کہ خواہ ان کے اپنے اساتذہ یا مربّی ومُرشد ہی کیوں نہ رہے ہو، اکابرین امت بشمول مذہبی وسیاسی قائدین سب پر انہوں نے نقد وجرح کی اور نظریاتی اعتبار سے جس چیز کو صحیح جانا اُسے دلائل وبراہین سے ثابت کیا مگر اختلاف کے وقت ادب ملحوظ رکھا ہے بے ادبانہ اور گستاخانہ کلمات کسی کے لئے بھی نہیں استعمال کیا اور نہ کبھی کسی کی خلوصِ نیت پر شک کیا جو کہ مولانا کا بہت بڑا کارنامہ تھا اور خود اپنی ذات پر جب بہت حملے ہوئے، طعن تشنیع کے وار کئے گئے اور بے جا الزامات لگائے گئے تب بھی یکطرفہ صبر کیا اور کسی بات کا جواب نہ دے کر خاموشی اختیار کی یہ بھی مولانا کا ایک حکیمانہ اسلوب تھا، یعنی ایک طرف مخالفتوں کا سیلاب اُمنڈ رہا ہے تو دوسری طرف مکمل خاموشی اور اعراض۔ مولانا نے باطل کو ناکارہ

بنانے کے حوالے سے حضرت عمر کا قول بتایا ہے کہ اگر تمہیں باطل کو توڑ نا ہے تو اس پر خاموش رہو۔ ''امتوا الباطل بالس وت عن''۔ محدثین کے مطابق یہ روایت حضرت عمر کی طرف غلط منسوب ہے لیکن اسی مفہوم سے ملتی جلتی ایک دوسری روایت حضرت عمر کے حوالے سے ابونعیم نے ''حلی'' میں لکھی ہے' جو یہ ہے ان للّٰلہ عبادا ٔیمیتو ن الباطل بھجر ہ۔ جس کا مطلب وہی ہے جو پہلی روایت کا ہے۔

یہ لمحات کسی مفکر کی زندگی میں اتفاقیہ نہیں آجاتے بلکہ اس کے پیچھے سالوں اور دہائیوں کی محنت، عرق ریزی، جانفشانی، تلاش، قربانی، فنائیت کارفرما ہوتی ہیں تب جا کر روشنی ملتی ہے اور پھر جا کر تحریروں اور گفتگو میں سوز و گداز پیدا ہوتا ہے۔ یہی معاملہ مولانا وحیدالدین خان کے ساتھ بھی رہا، انہوں نے زندگی کے قیمتی ترین اوقات علم و معرفت کی صحرانوردی میں گزارے۔ وقت کے گرم اور سرد ترین تھپیڑے سہے، علم جدید کی گہرائیوں میں اترے۔ قرآن واحادیث اور ذخیرہ ٔ اسلامی کا گہرا مطالعہ کیا، تجزیاتی اور تحلیلاتی اصولوں کو اپنایا، اسلوب جدید میں مہارت پیدا کی اور اسلامی تاریخ کے حضارتی ورثے کو بڑی باریک نظروں سے دیکھا اور پڑھا پھر اُن پر اپنی رائے دی، اسی طرح عہد عباسیہ میں برپا ہونے والی علمی اور فکری کاوشوں کو جانچا اور پرکھا اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر سائنٹفک انداز اور عصری زبان میں گفتگو کی بالخصوص قرآن حکیم کے تفسیری اثرات کے حوالے سے آپ نے بہت ہی عمدہ بات کہی کہ اے کاش وہ لوگ نزولِ قرآن کا اولین مقصد بھی مدنظر رکھتے' اگرچہ انہوں نے فصاحت، بلاغت، فنی محاسن، شان نزول، احکام قرآنی پر کام تو خوب کیا اور خوب تر کیا مگر قرآن جو یہ پکار رہا ہے ''بابرکت ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر قرآن کو اُتارا تا کہ وہ تمام دنیا کے لئے اگاہ کرنے والا بن جائے ''۔ تبَارَ الَّذِ نزَّلَ الفُرقَانَ علیٰ عَب دِ لِیُونَ لِل عَالَمِ نَ نذِراً۔ (سورالفرقان 1) قران حکیم کا داعیانہ مشن تھا اور امت مامورِ دعوت تھی۔ نبی کے ذریعہ امت کو یہ مشن دیا گیا تھا۔ رسول اللہ اور صحابہ کے زمانوں اور خیرالقرون میں قرآن کا یہ دعوتی عالمی

مشن پورا ہوتا رہا پھر حکمرانوں اور جبری سلطنتوں کا دور آیا۔ انہوں نے اپنے اعتبار سے دین کو چلایا، اپنے ہم خیال علماء اور مشائخ جمع کئے اور عہد اموی، عباسی، سلجوقی، فاطمی، عثمانی اور ترکی سب میں اپنے اپنے ذوق کے مطابق مسلکی اور گروہی اسلام کی نمائندگی کی گئی اور خیر القرونی اسلام اجتماعی طور پر ان کے یہاں نظر نہ آیا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہم انقلابی اسلام سے روایتی اسلام میں آ گئے۔ رسول اللہ کی تعلیمات، اسوہء حسنہ، محاسن اسلام اور قرآن حکیم کی آفاقی آیات کا انطباق یہ سب درس ہم پیچھے بھول گئے۔ بس رہ گیا ہمارے پاس مسلک اور مسلک اور پھر مسلک اور اس کے بعد جو کچھ چیزیں بچیں وہ تھیں رسومات، نعرے، تفاخر اور کچھ ظاہری اسلام جس کی نمائندگی ہم جا بجا کرتے رہتے ہیں۔ فرائض تو بہت دور کی بات ٹھہری' کتنے مسلمان اس کی نمائندگی کرتے ہیں وہ ہم سب جانتے ہیں۔ یہ ہیں ہم قرآن کے وارث اور نبی کے امتی!

مولانا کو بھی ہماری طرح موروثی اسلام ملا تھا مگر مولانا شعور کی عمر میں پہنچ کر مثل پیغمبر ابراہیم تشکیک میں مبتلا ہوئے' طویل جستجو، تلاش اور خدائی رہنمائی سے پھر سے اسلام کو ڈسکور کیا اور اس میدان میں آگے بڑھتے گئے۔ اپنے گہرے مطالعے اور معرفت سے وہ اسلام دنیا کے سامنے پیش کیا جو موروثی نہ تھا، رسومات اور بے جا باروں سے پاک وصاف تھا۔ مولانا بتاتے ہیں کہ امت میں جب بگاڑ آتا ہے تو دین کے نام پر فساد شروع ہوتا ہے اور اس فساد کی شکلیں الگ الگ ہوتی ہیں جو ہم سبھی جانتے ہیں۔ دین کے حوالے سے تفریق در تفریق بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ دین کی روح ہی ختم ہو جاتی ہے اور دین کے حوالے سے انسانی تشریحات کو اصل دین یا دین کے قریب تر مان لیا جاتا ہے اور قرآن یا احادیث کے خطابی پہلوؤں کو صرفِ نظر کر دیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم جو براہِ راست ہم سے مخاطب تھا ہم نے اس پر پہرے بٹھا دیے، احادیث نبوی جو ترجمانِ قرآن تھیں' اس کو ہم نے فقہی موشگافیوں میں لگا دیا یا پھر مسلکی ترجیحات کی ترجمانی میں لگا دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم مسلکی جھگڑوں، مناظروں اور غیر ضروری بحثوں

میں الجھ کر رہ گئے، آفاقی اسلام کی روح اختلافات، انانیت، مسابقت اور گروہ بازی میں دبتی چلی گئی اور پھر ہم دنیا میں ذلیل وخوار ہو گئے جب کہ ہم خیر اُمت تھے ہمارا مشن طے کر دیا گیا تھا۔

نْتُمْ خَ رَامَّۃٍ اُخْ رِجَتْ لِلنَّاسِتَامُرُ وْنَ بِالْمَعْ رُوفِ وَتَنْ وْنَ عَنِالْمُنْ رِ وَتُؤمِنُوْ نَ بِاللِّٰ — قرآن مجید، سورال عمران (110:3

''تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں (کی ہدایت) کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

مولانا وحید الدین خان کا فکری اسلوب: مولانا کا فکری اسلوب اور مخاطب ہونے کا انداز، طریقہء استدلال اور گفتگو کی زبان بہت ہی سائنٹفک اور فطرت کے مطابق ہے۔ الفاظ، طریقہء گفتگو یا کتابی اور تحریری زبان بہت واضح، سہل فہم اور حقیقت پر مبنی ہے۔ مولانا کے موضوعات اسلامی حقائق، معرفتِ اسلام، معرفتِ الٰہی، آیاتِ تخلیق، خدا اور بندے کا رشتہ داعی اور مدعو کا طریقہء کار، انسانیت، مقصدِ تخلیق، عاجزی، انکساری، عفو درگذر، صلح و اصلاح، امن و امان، عدل اور نظم و نسق، صبر و برداشت، ایثار و قربانی وغیرہ کے اردگرد پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ مولانا کی پوری زندگی خدا کی تلاش اور نجاتِ اخروی پر فوکس ہے۔ وہ نظریاتی اسلام جسے ہم Theoritical اسلام کہہ سکتے ہیں اس پر زیادہ مرکوز ہیں، عملی اسلام جسے ہم Practical اسلام کہتے ہیں اس پر مولانا اتنا فوکس نہیں کرتے جتنا نظری اسلام پر کرتے ہیں۔ practical اسلام یا اسلامِ ظاہری کا میدان مولانا دوسرے لوگوں اور دیگر اصلاحی جماعتوں اور گروہوں پر چھوڑ دیتے ہیں اور اس پر زیادہ نقد و جرح نہیں کرتے مگر اپنی ذات کی حد تک عملی اسلام پر عامل نظر آتے ہیں لیکن جہاں دوسروں کی زندگیوں میں عملی اسلام کا تعلق ہے مولانا اس پر زیادہ تعرض نہیں کرتے اور خاموشی اختیار کرتے ہیں یا یہ کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں کہ یہ بندے اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے۔ مولانا کا نظریاتی اسلام ہی عقائدی اسلام ہے جس کے بارے میں وہ

کہتے ہیں کہ حاملینِ اسلام پر غبار کی صدیوں کی گہری پرت پڑ چکی تھی اور وہ رسومات، اوہام، تقلیدات، مسالک پرستی اور اکابر پرستی جیسی فرسودہ چیزوں میں گرفتار تھے جبکہ اس کے پاس خالص تعلیمات، واضح پیغامات اور اصولی ہدایات موجود ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ تجدید دین کی ضرورت ہر دور میں اُمت کو رہی ہے اور خدا کے بندے ہر عہد میں قرآن حکیم اور سنت مطہرہ کی روشنی میں دین کی حقیقی تعبیر وتشریح بہتر اسلوب میں کرتے رہنے کے پابند ہیں۔ خدا نے قرآن مجید کو رہتی دنیا تک محفوظ کر دیا ہے اور وہ تمام خطاؤں سے پاک وصاف ہے۔ اس لئے وہی امت کا میزان اور دستورِ حیات ہوگا۔ اس کے بعد احادیث کا درجہ ہے جو دراصل قرآن ہی کی تشریح وتعبیر ہے اور پیغمبرانہ زبان میں ہے۔ احادیث کا یہ سب سے بڑا ذخیرہ اور اثاثہ ہمارے پاس تواتر کے ساتھ موجود ہے جس میں اسانید اور متون دونوں شامل ہیں اور قرآن حکیم کے ساتھ امت جس کو اپنے سینوں کے ساتھ چمٹائے ہوئے ہے وہ رسول اللہ کی احادیث ہیں۔ جب بھی دین میں افراط وتفریط کے ذریعہ کسی پہلو پر یلغار ہوگی تو ایسے وقت امت کے مُجدّد دین دینِ اسلام کی تشریح اسی قرآن وسنت کی روشنی میں زمانی تقاضوں کے مطابق انجام دیں گے تاکہ دین پر لگی گرد وغبار ہٹایا جاسکے اور پاکیزہ کیا جاسکے۔

مولانا وحید الدین خان منشاءِ اسلام یا منشاءِ خدا اور رسول پر بہت زور دیتے ہیں اور اسی کو اسلام کی اصل روح قرار دیتے ہیں۔ وہ اکثر یہ بات کہتے ہیں کہ اگر امت اور مسلمان منشاءِ دین سمجھ جائیں تو بہت ساری مسلکی اور تہذیبی وثقافتی نزاعات کا خاتمہ ہو جائے مگر امت اور مسلم قوم یا ان کے رہنما فروعی چیزوں میں الجھے ہوئے ہیں جب کہ اصل چیز اصولی دین ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ فروعات دین کی نفی نہیں کرتے اور نہ اس کی اہمیت کم کرتے ہیں بلکہ وہ فرقِ مراتب کی بات کرتے ہیں اور ترجیحات کی بات کرتے ہیں، اصولی دین مولانا کے نزدیک ترجیحاتِ دین میں شامل ہے اور فروعی دین کو امت پر چھوڑ دیتے ہیں مگر اس میں جنگ وجدال سے اجتناب کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

مولانا کی نظر میں فروعی دین سے مراد فقہی دین یا فقہ کے اختلافی اور تشریحی مسائل وغیرہ ہیں۔اسی طرح معاملات یا زندگی کے دیگر مسائل میں جہاں دین اسلام سے بالکل تعلق نہ ہوتو وہاں معاملہ اولوالامر اور اربابِ عقل ودانش پر چھوڑ دیتے ہیں اور پیغمبرانہ سنت کا حوالہ دیتے ہوئے تعبیر نخلہ کے واقعہ سے استشہاد کرتے ہیں۔جہاں رسول اللہ نے دنیاوی معاملات میں اختیارات اپنے پاس نہیں رکھے بلکہ جب دیکھا کہ پیغمبرانہ ہدایت کے باوجود کھجور کے باغوں میں پھول اور پھل نہیں آئے تو آپ یہ کہہ کر الگ ہوگئے ''کہ تم دنیا کے معاملات میں مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہواسلئے تم وہی کرو جو اس سے پہلے کرتے آئے ہو۔(انتم اعلم بامور دنیاکم) بہت سارے دنیاوی معاملات میں رسول اللہ صحابہ کرام یہاں تک کہ یہودیوں سے مشورے کرتے تھے۔

مولانا وحید الدین خان کا یہ ماننا رہا کہ انبیاء علیہم السلام پر آزمائشیں اس لئے ڈالی جاتی ہیں تاکہ ان کی امتیں اپنے اپنے نبی کے اسوہ سے رہنمائی لیں اور جب ان پر مشکل دور آئے تو وہ اپنے نبی کی زندگی دیکھ کر اسی کے مطابق عمل کریں۔رسول اللہ ﷺ کی امت بھی اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب وہ اپنے نبی کی زندگی اور طرزِ عمل پر چلنے لگے گی۔رسول اللہ کی زندگی تین دور میں بٹی ہوئی ہے۔

پہلا دور نبوت سے پہلے کا چالیس سالہ دور جس میں آپ صادق امین،غریبوں ،یتیموں، بیواؤں اور کمزوروں کے مسیحا کے طور پر متعارف ہوئے۔جہاں محمد کو خدمت خلق کا خوب موقع ملا اور آپ کی ایمانداری،سچائی،شرافت، پاکیزگی اور اخلاق کا پورے عرب معاشرے میں خوب چرچا ہوا۔یہاں تک کہ عرب میں آپ سب سے زیادہ سچے، قابلِ اعتماد اور شریف انسان تصور کئے گئے۔

دوسرا دور نبوت ملنے کے بعد کا ہے جس میں آپ نے کلمہ حق اور کلمہ توحید کا اعلان کیا اور لوگوں کو بتایا کہ خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔خدا کے سوا باقی خداؤں کا تصور باطل ہے اور قرآن خدا کی آخری کتاب ہے۔اور محمد خدا کے آخری رسول

ہیں اور آخرت برحق ہے جہاں سب کو خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنا حساب و کتاب پیش کرنا ہے۔ رسول اللہ کے اس اعلان سے مکہ اور آس پاس کی فضا میں ایک بھونچال پیدا ہو گیا اور زبردست مخالف فضا پیدا ہو گئی اور دن بہ دن مخالفت اور دشمنی زور پکڑنے لگی۔ مکہ کے لوگ رسول اللہ اور آپ کے ساتھیوں پر بے تحاشا ظلم کرنے لگے، یہاں تک کہ انہوں نے بہتوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ خانہ کعبہ اور کھلی جگہ میں عبادت پر پابندی لگا دی گئی اور جب اس سے تسکین نہ ہوئی تو بہت سے مسلمانوں کو مکہ سے نکال دیا اور ان کی جائیدادوں پر قبضہ کر لیا۔

نبی کی مکی زندگی سے جو ہمیں سبق ملا وہ تھا ایثار و قربانی، صبر استقامت، برداشت، خدائی تصور اور مشکل ترین حالات میں دین و ایمان کی حفاظت۔ مولانا وحید الدین خان نے انہیں باتوں کا ذکر کرتے ہوئے اور اسوہ نبی سے ہدایت لیتے ہوئے اُمت کے لئے مکّی ماڈل کو پیش کیا ہے کہ جب دِین اسلام پر یا اس کے ماننے والوں پر اس طرح کے حالات آئیں جیسے مکّی دور میں آئے تھے تو ایسی صورت میں رسول اللہ کا مکّی دور ہمارے لئے قابل عمل ہو جائے گا اور یہی اسوہ نبی ہوگا۔ ٹکراؤ کا راستہ ہمارے دین اور ہم کو نقصان پہنچائے گا۔ مولانا نے تڑپتے دل اور خلوص کے ساتھ معرفتِ الٰہی کی رہنمائی میں یہ ماڈل پیش کیا تا کہ جب اُمت پر سخت آلام و مصائب آئیں اور جبر و ظلم کی فضاء قائم ہو تو ایسی صورت میں نبی ﷺ کی سنت کو اپناتے ہوئے صبر و استقامت، ایثار و قربانی اور تحفظِ ایمان جیسی عظیم چیزوں پر عمل کریں اور بقول خان صاحب صبر بزدلی نہیں، صبر حکمتِ عملی ہے، اس سے اگلے دروازے کھلتے ہیں بشرطیکہ آپ میں بصیرت ہو۔

تیسرا دور مکہ سے بے دخلی اور خروج کے بعد کا ہے جس کو ہجرت مدینہ کا دور کہتے ہیں۔ جب رسول اللہ اور آپ کے صحابہ نے مدینہ کا رُخ کیا، تو وہ بے سروسامان تھے، جائیدادوں و گھروں سے بھی محروم تھے۔ مدینہ کے انصار آپ کے سپوٹر بن گئے اور انہیں اپنا بھائی قرار دیا، انہیں اپنی جائیدادوں اور گھروں میں شریک کیا، اس طرح ایک

اسلامی کنبہ کی بنیاد پڑی۔ مدینہ میں دیگر قومیں بھی آباد تھیں۔ خاص کر یہود جو کہ صاحبِ ثروت اور اثر ورسوخ والے تھے۔ عملاً مدینہ میں انہیں کا حکم چلتا تھا۔ رسول اللہ نے یہاں پہنچنے کے بعد دیگر قبائل کے ساتھ معاہدہ کیا، خاص کر یہود کے ساتھ اور مدینہ ایک ریاست قرار پایا جس کی سیادت اور قیادت رسول اللہ ﷺ کے پاس تھی۔ آپ نے مدینہ اور آس پاس کی تمام اقوام کو اپنے ساتھ ملا کر ایک معاہدہ کرلیا اور یہ طے پایا کہ ہم بحیثیت معاہدہ ایک قوم ہوں گے، سب کے حقوق برابر ہوں گے۔ سب کو مذہبی آزادی ہوگی، عدل وانصاف سب کے لئے ایک جیسا ہوگا، نظم وضبط ریاست کے ساتھ سب کی ذمہ داری ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

خان صاحب کے بقول مدنی دور سے جو سبق ہمیں ملا وہ تھا ایثار، قربانی، جذبہء بھائی چارہ، انسانیت، مساوات، عدل وانصاف، امن وسلامتی اور فراخ دلی وغیرہ۔ اب اگر امت کو مدینہ والے حالات میسر آجائیں جہاں وہ مختار ہوں اور قیادت وسیادت میں ان کا دبدبہ ہو اور دیگر قومیں ان کے زیر نگرانی ہوں تو ایسی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی مدنی ماڈل ہوگا جو عہد نبوی میں تھا یعنی سب کو برابری کا درجہ ملے گا اور وہاں کی فضا میں امن اور عدل ہماری ذمہ داریوں میں شامل ہوں گے اور یہ بات عین اسلامی اور نبوی اصولوں کے مطابق ہے۔

مولانا وحید الدین خان صاحب کا مدنی ماڈل دراصل اسلام اور مسلمانوں کا پُرامن تعمیری ماڈل ہے جو رسول اللہ کی مدینہ منورہ کی زندگی سے ماخوذ ہے۔ یہ ایک دعوتی اور بقائے باہمی کا سماجی نمونہ ہے جہاں طاقت کے بجائے حکمت، تصادم کی جگہ امن کا کردار نظر آتا ہے۔ مدینہ میں مسلمانوں نے پوری طاقت اور برتری ہوتے ہوئے بھی اشتعال کے بجائے حکمت برداشت اور دور اندیشی کو اپنایا اور یہی چیزیں ترقی کی بنیاد بنیں۔ مولانا کے بقول اصل مشن دلوں کی تبدیلی ہے نہ کہ اقتدار کی کشمکش اور یہی کام مدینہ میں رسول اللہ کے ساتھ مل کر انصار ومہاجرین نے کیا۔ انہوں نے مدینہ کی قدیم

روایات کو بدل ڈالا اور ایک مثالی اخوت اور جذبہء انسانی کی لاثانی نظیر قائم کی۔تہذیبی ،علاقائی اور نسلی اختلافات کے باوجود انہوں نے بقائے باہمی جیسے معاملات اور انسانی رشتوں کے تقدس کو اس کے اعلیٰ معیار پر رکھا۔ یہود اور منافقین کو بھی اپنے ساتھ رکھا اور خوشگوار تعلقات نبھائے جب تک کہ وہ خود ہی الگ نہ ہو گئے یا انہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی نہ کی تب تک وہ ساتھ رہے۔

عصری اسلوب کی ضرورت کیوں؟: مولانا کا یہ کہنا ہے کہ ہر دَور کی زبان، فکر اور مسائل مختلف ہوتے ہیں۔ اگر پرانے انداز میں بات کہی جائے تو موجودہ دور کے لوگ اسے سمجھنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ بات کو ایسے انداز میں پیش کیا جائے جو آج کے دور کے ذہن اور ضروریات سے ہم اہنگ ہو یعنی ایسا انداز جس میں بات کو اس طرح پیش کیا جائے کہ آج کا انسان اسے آسانی سے سمجھ سکے اور اس سے متاثر بھی ہو۔عصری کا مطلب ہوتا ہے موجودہ زمانے (Modern Age) کے اسلوب سے متعلق باتیں اور اسلوب کا مطلب ہے اندازِ بیان یا طریقہءاظہار۔ لہٰذا عصری اسلوب سے مُراد وہ اندازِ تحریر یا گفتگو ہے جو موجودہ دور کے حالات، تقاضوں، زبان اور سوچ کے مطابق ہو۔مثلاً آج کا دور سائنس، ٹیکنالوجی، میڈیا اور تیز رفتار انفارمیشن کا دور ہے، اس لئے آج تحریر یا تقریر میں وضاحت، سادگی، خاص کر تحریری اصطلاحات کے ساتھ سائنٹفک انداز، مضبوط دلائل اور عصری تعلیم گاہوں میں استعمال ہونے والی زبان اور طریقہءکار کو زیادہ اہمیت دی جائے گی۔

عصری اسلوب میں مشکل اور پُرانے الفاظ یا متروک تعبیرات کے بجائے سہل اور واضح زبان استعمال کی جاتی ہے تاکہ ہر شخص آپ کی بات بآسانی سمجھ سکے اور اُلجھن کا شکار نہ ہو۔عصری اسلوب میں جذباتیت کے بجائے عقل و منطق کو اہمیت دی جاتی ہے اور اپنی بات Scientific Temperament (سائنسی مزاج) کے مطابق لے کر چلنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا وحید الدین خان عصری اسلوب کو سب سے

زیادہ پسند کرتے تھے اور اسی میں لکھتے پڑھتے تھے۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات اور داعیانہ سرگرمیوں کو عصری اسلوب میں پیش کیا تا کہ جدید ذہن رکھنے والے لوگ انہیں بہتر طریقے سے سمجھ سکیں۔ عصری اسلوب موجودہ دور کی ضرورت اس لئے ہے کہ اس اسلوب کے ذریعہ نہ صرف علوم وآداب کو بہتر انداز میں منتقل کیا جاسکتا ہے بلکہ سوسائٹی میں مثبت تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے۔ ایک لکھنے والا یا بولنے والا شخص جب عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق لکھتا یا بولتا ہے تو اس کی تحریر یا آواز زیادہ لوگوں تک پہنچتی ہے اور دلوں میں اثر کرتی ہے۔ عصری اسلوب کا دوسرا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان غیر ضروری طوالت اور پیچیدگی سے محفوظ رہتا ہے۔

مولانا وحید الدین خان کا اصلاحی اور دعوتی اسلوب: مولانا نے دنیا کے سامنے اسلام کا تعارف عصری اسلوب میں ایسے دور میں پیش کیا جب دنیا سائنسی ترقی، فکری آزادی اور سیاسی کشمکش سے گزر رہی تھی۔ مولانا کا سب سے نمایاں وصف یہ تھا کہ انہوں نے دین اسلام کو ایک ایسے انداز میں پیش کیا جو جدید تعلیم یافتہ ذہن، سائنٹفک سوچ اور عالمی علمی ماحول سے ہم اہنگ ہو۔ انہوں نے دین کی اصل تعلیمات کی ترجمانی کرتے ہوئے اسے ایسے طرز اور اسلوب میں لکھا یا بیان کیا جو موجودہ دور کے علمی تقاضوں، زبان اور فکری سطح کے مطابق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسلامی دعوت یا اس کے پیغام کو جدید ذہن کے قریب تر کر دیا۔

مولانا وحید الدین خان صاحب کی تحریریں مشکل اور پیچیدہ افکار وخیالات سے پاک ہوتی ہیں۔ وہ مناظرانہ انداز کے بجائے دعوتی اور اصلاحی لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ قرآن وحدیث کی تعبیرات یا تعلیمات کو نہایت آسان انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے تذکیر القرآن کا انداز۔ تو دوسری جانب اسلام کو درپیش چیلنجز کا حل وہ جدید سائنس اور عقلی تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ جدید ذہن اور تعلیم یافتہ طبقے کے لئے ان کی کتاب ''مذہب اور سائنس'' یا ''اسلام اور عصر حاضر'' یا ''مذہب اور جدید چیلنج'' اس کی

روشن مثالیں ہیں۔مولانا نے یہ ثابت کیا کہ اسلام عقل کے خلاف نہیں بلکہ عقل کے عین مطابق ہے جو ہم ان کی تحریروں یا کتابوں میں جابجا دیکھ سکتے ہیں۔مثلاً خدا کے وجود یا آخرت کے تصور کو انہوں نے کائنات میں بکھری نشانیوں ،فطرت کے نظام ، آفاق وانفس کے پیچیدہ راز یا اجرام فلکی کے سائنسی انکشافات کو ایک خدا کے وجود کے طور پر بہت موثر اور سائنٹفک انداز میں پیش کیا ہے۔

مولانا کے نزدیک اسلام کا اصل مشن عصری اسلوب میں ''دعوتِ دین'' ہے نہ کہ سیاسی غلبہ۔ان کا یہ تصور تھا کہ ہر دور مسلمانوں کے لئے دعوت کا دور رہا ہے نہ کہ تصادم کا دور، خاص کر دورِ جدید۔مولانا نے اسلام کو سیاسی تحریک کے بجائے فکری اور ایک روحانی تحریک کے طور پر دنیا بھر میں پیش کیا۔ان کا یہ ماننا تھا کہ اصل تبدیلی انسان کے اندرونی شعور کی تبدیلی سے آتی ہے، اسی لئے وہ فرد کی اصلاح پر بہت زور دیتے تھے۔انہوں نے اسلام کو ایک ایسے دین کے طور پر پیش کیا جو رواداری، برداشت، خیر خواہی، سچائی، خبر گیری اور بھائی چارگی کی تعلیم دیتا ہو۔مولانا کے اس اندازِ گفتگو کو دُنیا بھر میں سراہا گیا اور بہت ساری نئی نسل اسلام کے قریب آئی۔البتہ بہت سے ناقدین نے ان کے بعض نظریات سے اختلاف بھی کیا، خصوصاً سیاسی مسائل کے حوالے سے۔لیکن اس میں بالکل بھی شک نہیں کہ انہوں نے اسلام کو ایک مثبت، معقول، عالمگیر اور پُر امن دین کے طور پر پیش کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔مولانا نے نہ صرف اسلام کو ایک عالمی اخلاقی نظام کے طور پر متعارف کرایا بلکہ انہوں نے اس سلسلے میں مختلف مذاہب کے رہنماؤں سے ناصحانہ انداز میں مکالمہ کیا اور دورانِ مکالمہ مشترکہ انسانی قدروں پر زور دیا جو کہ قرآن حکیم کی آیات اور اس کے پیغام کے عین مطابق ہے۔

مولانا کا طریقہء کار ہمیشہ سے جذباتیت کے بجائے دلائل، تجزیے اور تحقیقات پر قائم تھا، وہ جدید سائنس اور علوم جدیدہ سے مثالیں اخذ کرتے تھے تاکہ دین کی تشریح جدید ذہنوں میں رچ بس سکے اور وہ انہیں اسلام کی حقانیت سمجھا سکیں۔انہوں نے اپنے

دعوتی مشن کے لئے ٹکراؤ اور مجادلہ کا راستہ چھوڑ کر ناصحانہ مکالمہ (Peacfull Dialogue) کا راستہ اپنایا جس میں مدعو کی خیر خواہی، رواداری اور تکریم کا پورا خیال رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا دعوتی مشن مقبول ہوا اور عالمی طور پر متعارف ہوا۔ سی پی ایس انٹرنیشنل اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ مولانا نے بہت غور وفکر کرنے اور صلاح ومشورے کے بعد اس کے قیام کا فیصلہ کیا۔ سی پی ایس سے پہلے مولانا کی صباحی اصلاحی مجلسیں لگتی تھیں اور اتوار کے دن ہفتہ واری پروگرام ہوتے تھے جو مولانا کی Spiritual Classes کہلاتی تھیں اور غالباً یہ سلسلہ مولانا کی آخری عمر تک قائم رہا۔ جس میں ہر طبقے کے لوگ شریک ہوتے تھے اور مولانا ان سے عصری اسلوب اور سادہ زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ اُسی طرح وہ مختلف ذرائع ابلاغ، ڈیجیٹل پلیٹ فارم اور میڈیا کا مثبت استعمال اپنے دعوتی پیغامات کو پہنچانے کے لئے بخوبی کرتے رہے۔

یہ بات سبھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ الرسالہ میگزین نے تعمیری اور داعیانہ ذہن بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ الرسالہ اردو کی واحد میگزین ہے جس نے ابتداء سے لے کر آج تک اپنا ایک انوکھا طریقہ رکھا۔ اس کے اسلوب اور مضامین انوکھے اور عبرت ومعرفت سے لبریز ہوتے ہیں۔ عام طور پر مولانا ایک صفحے میں پورا مضمون بیان کر دیتے تھے اور پڑھنے والے کو تسلی ہو جاتی اور انشراح ہو جاتا۔ مولانا جو بات ایک پیج میں کہہ جاتے تھے وہی بات سمجھنے کے لئے ہمیں کئی کئی کتابیں پڑھنی پڑتیں، تب بھی مضمون تشنہ رہتا۔

مولانا کے نزدیک معاشرے کی تبدیلی کا راستہ فرد کی فکری اور اخلاقی اصلاح سے ہو کر گزرتا ہے۔ وہ اجتماعی انقلاب کے بجائے انفرادی انقلاب کے قائل تھے۔ مولانا کے اسلوب کی فکری بنیادوں میں جدید دنیا میں مذہب کا پُرامن کردار بہت اہم مقام رکھتا ہے اور شاہِ کلید کا درجہ رکھتا ہے۔ امن کے موضوع پر مولانا نے بہت کچھ الرسالہ کے اندر لکھا ہے اور متعدد کتابیں بھی تحریر کی ہیں مثلاً امن عالم، کشمیر میں امن

وغیرہ۔ جہاں مولانا امن پر زور دیتے ہیں وہیں وہ ہر موقعہ پر صبر کی تلقین کرتے ہیں اور صلح حدیبیہ یا مکی دور کو بطور خاص پیش کرتے ہوئے اسوہء نبوی کی یاد دلاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ صبر یا برداشت بُزدلی یا کمزوری نہیں حکمت عملی ہے۔ وہ ٹکراؤ، احتجاج اور محاذ آرائی کو ناعاقبت اندیشی سے تعبیر کرتے ہیں اور امت کو ان چیزوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مولانا کا یہ کہنا تھا حالات سے ٹکرانے کے بجائے مواقع تلاش کئے جائیں نظام سے لڑنے کے بجائے خود احتسابی پر کام کیا جائے اور مخالف کو شکست دینے کے بجائے اس کے اصلاح کی پُر امن کوشش کی جائے ، اختلافات کو برداشت کرنا سیکھا جائے۔ اختلافاتِ نظر ہونا ایک فطری بات ہے اس میں ذاتی عناد اور نفرت کو ہوا نہ دی جائے اور علمی اسلوب میں دلائل کے ساتھ ایک دوسرے کی تردید یا تنقید کی جائے مگر ادب اور لحاظ ملحوظِ نظر رہے۔ اس میں تضحیک اور تخریب کا مزاج نہ ہو۔ ورنہ اصلاح کے بجائے فساد نمودار ہوگا۔ علمی ڈائیلاگ کو پر امن طریقے پر فروغ دیا جائے لیکن مقصد تعمیری ہو۔ ظَہَرَ الفَسَادُ فِی البَرِّ وَ البَحرِ بِمَا کَسَبَت اَیدِی النَّاسِ لِیُذِیقَھُم بَعضَ الَّذِی عَمِلُوا لَعَلَّھُم یَرجِعُونَ۔ (سورہ الروم، ایت 41) [ترجمہ خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہوگیا، اس کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا، تاکہ وہ انھیں اس کا کچھ مزہ چکھائے جو انھوں نے کیا ہے، تاکہ وہ باز آجائیں۔]

علماء کے لئے عصری اسلوب کی ضرورت اور مولانا کی ضروری تلقین: ہر دَور میں علماء معاشرے کی رہنمائی کا اہم ذریعہ رہے ہیں۔ وہ ہر زمانے میں دین کی تعلیمات کو سمجھانے اور اسے لوگوں تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ دورِ جدید میں جہاں سائنسی ترقیوں، فکری تبدیلیوں اور معاشرتی مسائل میں اضافہ ہوا وہیں پر علماء کی ذمہ داریاں اب پہلے سے زیادہ بڑھ گئیں ہیں اور بقول مولانا وحیدالدین خان، دورِ جدید نے انسان کو اظہار رائے کی آزادی دی، تعلیم کے وسیع تر مواقع اور سائنسی ترقیات دیں۔ اِن سب انفجار نے انسان کو پاور فل بنا دیا ہے جبکہ ماضی میں ایسا نہ تھا، پیغامات کو

عام کرنے کے وسائل محدود تھے لیکن آج کے دور میں میڈیا، انٹرنیٹ اور جدید ٹیکنالوجی نے دوسری آسانیوں کے ساتھ ساتھ اہل علم کے لئے دعوت وتبلیغ کے بھی دروازے کھول دیے۔ مولانا کے نزدیک یہ دور اسلام کے پیغامات کو دنیا تک پہنچانے کا بہترین وقت ہے، لہٰذا علماء کو چاہئے کہ وہ جدید علوم سے واقف ہوں تا کہ دین کو موجودہ دور کے مسائل اور حالات میں پیش کرسکیں۔ جدید دنیا میں سائنسی ایجادات، ٹیکنالوجی اور میڈیا کے اثرات نے انسانی زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب اگر علماء ان تبدیلیوں کو نہ سمجھیں تو وہ نئی نسل کی رہنمائی درست انداز میں نہیں کر سکتے۔ مولانا کے نزدیک علماء کی ایک اہم ذمہ داری نوجوان نسلوں کی رہنمائی اور انہیں عصری اسلوب میں صحیح مواد پیش کرنا بھی ہے کیونکہ آج کا نوجوان سائنسی اور عقلی انداز میں بات کو سمجھنا چاہتا ہے، اس لئے علماء کو چاہئے کہ وہ دین کی تعلیمات کو دلیل اور تحقیق کے ساتھ عصری انداز میں پیش کریں تا کہ نوجوان نسل دین سے وابستہ رہ سکے۔ وہ بتاتے ہیں کہ دین کا اصل مقصد انسانوں کی ہدایت ہے اور انہیں خیر ورشد کا راستہ دکھاتا ہے تا کہ وہ اپنے خالق و مالک کو پہنچان سکیں اور اپنی پیدائش کا اصلی مقصد جان سکیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہیں علم واخلاق، امن وسلامتی اور انسانیت کا درس بھی اتنا ہی ضروری ہے اور یہ وقت کے علماء کی اہم ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ دین کو تشدد یا سختی کے بجائے حکمت اور محبت کے ساتھ پیش کریں تا کہ لوگ دین کو بہتر طریقے سے سمجھ سکیں۔ علماء کو برداشت اور رواداری کا مظاہرہ ہر حال میں کرنا چاہئے کیونکہ وہی قوم کے نمائندہ ہیں اور انبیاء کے وارث ہیں۔ مولانا کے مطابق جدید دنیا مختلف مذاہب، ثقافتوں اور نظریات کا مجموعہ ہے ایسے ماحول میں علماء کو چاہئے کہ وہ اختلافات اور اپسی مسلکی نزاعات کو بھلا کر پرامن مکالمے کے ذریعہ اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش کریں تا کہ وہ امت کی بہتر انداز میں رہنمائی کرسکیں۔ مولانا کا کہنا ہے کہ جب علماء آپس میں مثبت کردار ادا کریں گے تو معاشرہ بھی بہتر ہوجائے گا کیونکہ علماء معاشرے کی رہنمائی میں بنیادی کردار ادا کرتے

ہیں۔اگر علماءان ذمہ داریوں کو پورا کریں تو وہ نہ صرف دین کی درست تصویر پیش کر سکتے ہیں بلکہ ایک پرامن معاشرہ اور ترقی یافتہ سماج تشکیل دے سکتے ہیں۔معاشرے میں اخلاقی اقدار، سچائی، دیانتداری اور بھائی چارے کوفروغ ملے گا اور قوم وسماج کی اصلاح ہوتی رہے گی۔

مولانا وحیدالدین خان نوجوان نسل کو بھی دورجدید کا بہت اہم حصہ قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں، مثبت سوچ اپنائیں اور اسلام کوعلمی اور فکری انداز میں سمجھیں، نوجوان اگرعلم وکردار دونوں میدانوں میں مضبوط ہوں گے تو وہ اسلام کے پیغامات کو دنیا بھر میں زیادہ بہتر انداز میں پھیلا سکتے ہیں بشرطیکہ علماءکرام ان کی صحیح رہنمائی کے لئے موجود ہوں۔ کیونکہ دورِ جدید دراصل مسلمانوں کے لئے چیلنج نہیں بلکہ ایک موقع ہے جس سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔

مولانا وحیدالدین خان عصرِ حاضر میں دعوتِ دین اور داعی کے سلسلے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''مخاطب افراد تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے داعی اور مدعو کی زبان ایک ہو، دعوت کو موثر اور قابلِ فہم بنانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ پیغام کو اس اسلوب میں ڈھال کر پیش کیا جائے جس سے مخاطب مانوس ہے جس کو وہ اپنے نزدیک اہمیت دیتا ہے اور جس کو قابلِ اعتماد سمجھتا ہے''۔

وہ استدلال اور دلیل کے سلسلے میں بہت اہم اور قابلِ غور نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں اور غرناطہ کے مشہور عالم علامہ شاطبی کی یہ بات بطورمثال پیش کرتے ہیں ''کسی دعویٰ کے حق میں جب کوئی دلیل دی جائے تو ضروری ہے کہ مخاطب اس کا دلیل ہونا تسلیم کرتا ہو۔اگر دلیل فریقِ ثانی کے نزدیک نزاعی ہوتو ایسی دلیل کو پیش کرنا بے کار ہوگا۔اس سے نہ کوئی فائدہ ملے گا اور نہ کوئی مقصد حاصل ہوگا۔[ذَا ◌َان الدَّ لِلُ عَنَ ْال خَص مُمتَنَا زَعًا فِ، فَلَ س عِن دَ ْبِدَلِ لٍ ، فَصَا رَ الِ تَ انُ بِ عَبَثًا لاَ ◌ْف ِ دْ فَا ئِدَ ةً وَلاَ ◌َ ح صُلُ بِ ال مَق صُو دْ۔ (الموافقات ف اصول الا ح ام، ج 4،

ص198)]

مولانا وحیدالدین خان اور اہل علم ودانش کے فکری اور نظری اسلوب کے فرق کی جھلکیاں:

یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا کا اسلوبِ گفتگو علماء کے اسلوبِ گفتگو سے بہت جداگانہ ہے اور دونوں میں زمین آسمان جیسا فرق ہے نہ صرف علما بلکہ عام دانشوروں اور اہل علم حضرات سے بھی الگ ہے۔ مولانا جس اسلوب اور فریم میں گفتگو کرتے ہیں وہ جہاں ایک طرف سائنٹفک ہے تو دوسری طرف روحانی، دعوتی، فکری اور نظریاتی ہے۔ وہ اپنی گفتگو فطرت اور حقیقت کے قریب رکھتے ہیں جس سے اسلوبِ بیان میں حسن اور ندرت پیدا ہوجاتی ہے اور ضمیر سے ایک آواز آتی ہے کہ یہی وہ سچ ہے جس کی تلاش میں میں اب تک سرگراں تھا مگر کسی حصار کے باعث لوگ مولانا کی ان باتوں کو کھل کر بیان نہیں کر پاتے۔ ممکن ہے اس سے اپنے ایوانوں میں بھونچال آنے کا اندیشہ ہو یا مخالفتوں کا سیلاب امنڈ آنے کا خطرہ ہو۔

مولانا اور علماء امت کے اسلوب میں یہ فرق کوئی سادہ فرق نہیں بلکہ نظریے اور ترجیحاتِ دین، اولولیاتِ دین کا فرق ہے مثلاً مولانا کی دعوت کا محور فرد کی اصلاح اور اس کی فکری تربیت پر مرکوز ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب فرد بدلے گا تو معاشرہ خود بخود بدل جائے گا، ان کے برعکس معاصر اہل علم کی بڑی تعداد اجتماعی تبدیلی، تحریک اور تنظیم سازی پر یقین رکھتی ہے اور عوامی جلسے جلوسوں، مناظروں اور تردید مسالک پر مرکوز ہے۔ یا مولانا جب اظہار رائے کی بات کرتے ہیں تو اس میں انسان کی پوری آزادی کا خیال رکھتے ہیں اور دلائل کی روشنی میں کھلے مکالمے کے قائل ہیں جب کہ معاصر علماء کے یہاں اظہارِ رائے، نقد، مذہبی یا مسلکی معاملات بند گلی کی طرح ہیں اور وہ یہاں پر جمود کا شکار ہیں۔

مولانا کے نزدیک امن اسلام کی بنیادی اور مستقل تعلیم ہے۔ ان کے یہاں احتجاج، ردعمل، تصادم، ٹکراؤ، مناظرہ کے لئے جگہ نہیں۔ مولانا کے بقول امن صرف عدم

جنگ کا نام نہیں بلکہ اسی کے ساتھ عدل، آزادی، احترام اور باہمی تعاون بھی امن کے لئے ضروری ہیں۔ وہ امن کو انصاف کے ساتھ بریکٹ نہیں کرتے بلکہ دونوں کو الگ کرتے ہیں، صلح حدیبیہ کے واقعہ سے بتاتے ہیں کہ پہلے اس صلح کے نتیجے میں امن قائم ہوا لیکن انصاف جا کر فتح مکہ کے بعد حاصل ہوا۔ جب کہ معاصر اہل علم کی نظروں میں عدل کے ساتھ انصاف بریکیٹ ہوتا یعنی وہ امن کو انصاف کے ساتھ لے کر چلتے ہیں' احتجاجات، جمہوری دستوری حقوق امن کے قیام کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں۔ جب کہ مولانا کے یہاں امن ہمیشہ یکطرفہ صلح کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے نہ کہ دوطرفہ شرائط پر۔ مولانا کا فلسفہء امن صرف مسلمانوں کے لئے نہیں ہے بلکہ وہ اپنا اصول انٹرنیشنل مسائل کے حل کے لئے بھی پیش کرتے ہیں جس میں مسلم اور دوسرے سبھی شامل ہیں۔ اسی طرح خان صاحب یکطرفہ اخلاقیات کے قائل رہے، جب کہ زیادہ تر اہل علم اور ارباب فکر ونظر دوطرفی اخلاقیات کے قائل ہیں اور اگر دونوں کا جائزہ لیا جائے تو اسلام اور آسمانی مذاہب اور خود نبی کی سیرت اور اسوہ یکطرفی اخلاقیات پر قائم ہے۔

اسی طرح مولانا وحید الدین خان کا موقف یہ ہے کہ موجودہ دور کے شاکلہ انسانی کو سمجھنے کے لئے سائنٹفک اپروچ اور عصری باخبری کی ضرورت درکار ہے اور اہل علم کا کام یہ ہے کہ وہ شعورِ انسانی کے نگراں بنیں، ہر دور میں شعورِ انسانی کی صحیح تشکیل کے لئے معلمانہ کردار بہت ضروری ہے تا کہ شاکلہ انسانی فطرت کی راہ سے بھٹکنے نہ پائے۔ مولانا کے مطابق اسلام میں اہل علم اور اہل سیاست کے دائرہ کار کو بنیادی طور پر الگ کر دیا گیا، اہل علم ابدی طور پر کونیتِ بشری (عقلیتِ بشری) کے محافظ ہیں جب کہ اہل سیاست امارتِ انسانی (سیاست وحاکمیت) کے محافظ ہیں اور جب تک زندگی کا نظام اس تقسیمی اصول پر چلتا رہے گا تب تک معاملہ ٹھیک رہے گا لیکن جب اس تقسیم میں خلل واقع ہو جائے تو وہ نظم بگڑ جائے گا اور شاکلہ انسانی فطرت سے ہٹ جائے گی۔

مذکورہ بالا یہی وہ بنیادی اور اصولی فرق ہے جو مولانا اور دیگر اہل علم کے

درمیان رہا ہے، اہل علم امارتِ بشری اور کونیتِ بشری کی تقسیم کو درست طریقہ پر سمجھ نہیں سکے جس کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں اور اجتہادی خطائیں واقع ہوئیں۔ اس سلسلے میں ذرا مولانا کو ملاحظہ فرمائیں: ''زندگی میں کونیتِ بشری کا معاملہ امارتِ بشری سے زیادہ اہم ہے، کونیتِ بشری کی حیثیت بنیاد کی ہے اور امارتِ بشری کی حیثیت اوپری ڈھانچہ کی۔ علماء ابدی طور پر کونیتِ بشری کے نگراں ہیں، ان کا کام یہ ہے کہ وہ ہر دور میں تکوینِ شعور یا شاکلہ انسانی کی تصحیح کرتے رہیں اور امارتِ انسانی یا سیاسی ڈھانچہ کی تولیت کا کام اہل سیاست کے حوالے کریں، زندگی کا نظام جب تک تقسیمِ عمل کے اس اصول پر چلے گا وہ درست رہے گا اور جب یہ تقسیم عمل باقی نہ رہے تو زندگی کا نظام بگڑ جائے گا، صحیح شاکلہ انسانی سے صحیح نظامِ حکومت برآمد ہوتا ہے اور غلط انسانی شاکلہ سے غلط نظامِ حکومت''۔

.....اسلام نے امت کے لئے آئندہ سرگرمیوں کا رُخ متعین کر دیا تھا، دورِ اوّل میں اصحابِ رسول کی ایک جماعت جہاد کے عمل میں مشغول ہوئی اسی کے ساتھ ان کی دوسری جماعت (مثال کے طور پر عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن مسعود، عبداللہ ابن عمر وغیرہ) علمی اور دعوتی شعبوں میں اپنے آپ کو وقف کئے رہی۔.....صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین میں بھی یہی تقسیم قائم تھی۔ تقریباً ایک ہزار سال تک یہ صورتحال قائم رہی، یہ لوگ قراء، محدثین، فقہا، علماء، دعا، صوفیا اور معلمین وغیرہ کی صورت میں یکسوئی کے ساتھ اپنے مخصوص میدان میں سرگرم عمل رہے۔ اسی تقسیمِ کار کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ وہ عظیم ملّی اور دعوتی تاریخ بنی، جو آج ملت اسلامیہ کا انتہائی قیمتی اثاثہ ہے۔ اگر تمام لوگ جہاد و قتال کی سرگرمیوں میں مصروف ہو جاتے تو یقینی طور پر اسلام کی تاریخ میں ایک خلاء پیدا ہو جاتا جو قیامت تک کبھی دوبارہ پر نہ ہوتا۔ پھر مولانا آگے لکھتے ہیں'' راقم الحروف کا اندازہ ہے کہ علماء کو صحیح طور پر اس کا اندازہ ہی نہیں کہ موجودہ زمانے میں کونیتِ بشری میں کیا تبدیلی آئی ہے اور آج کا وہ انسانی شاکلہ کیا ہے؟ جس کو سمجھنا اور جس کی تصحیح کرنا وہ پہلا ضروری کام ہے جس میں انہیں سب سے پہلے مصروف ہونا چاہئے''۔

زمانی تبدیلی کا ادراک اور عصری ضروریات کے حوالے سے مولانا اپنے نقطہء نظر اور علماء کے نقطہءنظر پر خود ہی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں ’’موجودہ زمانے کے علماء کی یہ غلطی ہے کہ انہوں نے مغربی قوموں کے غلبہ کو صرف سیاسی غلبہ کے ہم معنی سمجھا حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ ایک طاقتور تہذیب کی یلغار تھی ، ان قوموں کو بالفرض سیاسی جنگ کے میدان میں شکست ہوجائے تب بھی ان کا غلبہ باقی رہے گا‘‘...... مغربی قوموں کے غلبہ وترقی کا اصل راز یہ تھا کہ انہوں نے شاکلہ انسانی کو تبدیل کر دیا تھا ان کے لائے ہوئے علمی انقلاب نے ساری دنیا کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اسی طرح سوچیں جس طرح اہلِ مغرب سوچتے ہیں۔ وہ چیزوں کے بارے میں اسی طرح رائے قائم کریں جس طرح اہل مغرب کرتے ہیں۔اہلِ مغرب سے کامیاب مقابلہ کے لئے ضروری تھا کہ انہیں فکر میں شکست دی جائے ،اہل مغرب پر فتح پانے کے لئے وسیع تر معنوں میں شاکلہ انسانی کو دوبارہ بدلنے کی ضرورت تھی مگر علماء سیاسی جھگڑوں میں مشغول ہونے کی وجہ سے نہ اس راز کو سمجھ سکے اور نہ اس کے لئے انہوں نے کوئی حقیقی عمل انجام دیا۔مولانا اس بات کا استشہاد قرآن سے لیتے ہیں اور لکھتے ہیں ’’قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے شاکلہ (فکری مزاج) کے تحت عمل کرتا ہے اس کا شاکلہ اگر شاکلہ ضلالت ہوتو اس سے غلط عمل صادر ہوگا اور اگر اس کا شاکلہ ہدایت ہے تو اس سے صحیح عمل کا صدور ہوگا۔قُل کُلٌّ یَّعمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ فَرَبُّکُم اَعلَمُ بِمَن ھُوَ اَھدٰی سَبِیلًا۔(سورہ الاسراء،آیت 84)[ترجمہ ’’فرمادیجئے ہر کوئی اپنے اپنے طریقہ وفطرت پر عمل پیرا ہے،اور آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ سب سے زیادہ سیدھی راہ پر کون ہے۔‘‘]

سنگِ گراں: اِنَّ اللّٰہَ یَبعَثُ لِھٰذِہِ الاُمَّۃِ عَلٰی رَاسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَن یُّجَدِّدُ لَھَا دِینَھَا
(ابوداؤد/طبرانی)

خدائے تعالیٰ اس امت کی رہنمائی کے واسطے ہر صدی کے شروع میں ایسے لوگوں کو بھیجتا ہے جو امت کے لئے تجدید دین کا کام کرتے ہیں۔

اس وقت بہت سارے اہل علم اور اصحاب فکر ونظر کا یہ ماننا ہے کہ مولانا وحید الدین خان بھی انہی مجدّد دینِ اسلام میں شامل تھے جنہوں نے اسلام کی شبیہ کی دور حاضر میں تجدید کی اور دین اسلام پر لگنے والی گردوں اور غباروں کو صاف کیا اور معرفت حق کا راستہ دکھایا۔ اپنوں، غیروں اور اجنبیوں نے جو دین اسلام کی شبیہ خراب کی تھی وہ انہوں نے ٹھیک کی۔ آپ نے عصری اسلوب میں اسلام کا جو خاکہ یا نقشہ کھینچا ہے، وہ وہی اسلام ہے جو صحابہ کرام اور دور نبوی ﷺ میں نظر آتا تھا۔ انہوں نے قرآن وسنت اور مزاج نبوی ﷺ سے استشہاد کہتے ہوئے بہت ہی مدلل انداز میں باتیں امت کے سامنے پیش کیں۔ مولانا نے اپنے مشن کی راہ میں حائل مشکلات کو پوٹاشیم سائنائڈ کھانے سے تعبیر کیا ہے۔ واقعہ مختصر یہ ہے کہ بڑے بیٹے ظفر الاسلام صاحب نے لیبیا سے اپنے والد کو خط لکھا کہ میں واپس ہندوستان آکر آپ کے احیائی مشن میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ اس پر مولانا (والد محترم) نے جواباً خط لکھا جس میں لکھا تھا کہ سائنس دان پوٹاشیم سائنائڈ کا ذائقہ معلوم کرنا چاہتے تھے اور یہ اُس وقت بغیر چکھے ممکن نہیں تھا کہ وہ نمکین ہے یا میٹھا' لہٰذا کچھ بندوں نے ہمت جٹا کر ذائقہ معلوم کرنا چاہا جس نے سب سے پہلے سائنائڈ چکھا، وہ ابھی حرف "S" ہی لکھ پایا تھا کہ زہر سے اسکی موت واقع ہوگئی اس کے بعد دوسرے آدمی نے آگے بڑھ کر سائنائڈ چکھا اور وہ ابھی حرف "S" کے آگے "A" لکھ پایا تھا کہ اس کی بھی موت ہوگئی۔ پھر وہ اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہارے باپ نے ایک بار پوٹاشیم سائنڈ چکھ کر "S" لکھا ہے اور اب اگر تم اسے چکھ کر "A" لکھنا چاہتے ہو تو آجاؤ۔ مولانا وحید الدین خان کو اس راہ کے سنگِ گراں کا علم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جو قربانیاں اور سرفروشیاں انہوں نے دیں ہیں وہ جانوں کا نذرانہ مانگتی ہیں۔ احیاء اسلام کا کام فنائیت مانگتا ہے۔ سخت ترین حالات سے گزرنا پڑتا ہے اور خود کو وقت کی بھٹی پر تپانا پڑتا ہے تب جا کر کوئی مجدد یا مفکر احیاء اسلام کا کام انجام دے پاتا ہے۔ مفکر کو تو موت آجاتی ہے مگر اس کی فکر نہیں مرتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کچھ افکار

معاصرین زمانہ کی سمجھ سے ماوراہوتے ہیں یا انہیں سمجھ نہیں آتا اور کچھ زمانے بعد چل کر وہی افکار کیمیائے علاج تصور کئے جانے لگتے ہیں۔ یہی کچھ حال مولانا کے افکار ونظریات کا ہے۔

مراجع:

کاروان ملت مولانا وحیدالدین خان
ظہور اسلام مولانا وحیدالدین خان
حکمت اسلام مولانا وحیدالدین خان
اظہارِ دین مولانا وحیدالدین خان
کتاب معرفت مولانا وحیدالدین خان
امن عالم مولانا وحیدالدین خان
فکر اسلامی مولانا وحیدالدین خان
اسلام اور عصر حاضر مولانا وحیدالدین خان
اسلام پندرھویں صدی میں مولانا وحیدالدین خان
مذہب اور سائنس مولانا وحیدالدین خان
پیغمبر انقلاب مولانا وحیدالدین خان
شتم رسول مولانا وحیدالدین خان
ادراک زوال امت راشد شاذ
وحیدیات صدیق احمد شاہ

☆☆☆

Azadi ke baad Jammu Kashmir mein Urdu Drama by Mohd. Iqbal Mir

(Research Scholar dept. of Urdu BGSB University, Rajouri) cell-9149717581

محمد اقبال میر (ریسرچ اسکالر، شعبہء اردو، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری)

آزادی کے بعد جموں وکشمیر میں اُردو ڈراما

ریاست جموں وکشمیر کو ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی، سماجی، تہذیبی وثقافتی اور جغرافیائی حوالے سے نمایاں اہمیت حاصل رہی ہے۔ ریاست میں اُردو زبان کے آغاز و ارتقاء اور ترویج وترقی کی بات کی جائے تو یہ صوبہ ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے برابر نظر آتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں پر اُردو زبان کی آمد دوسری ریاستوں کے مقابلے میں قدرتاخیر سے ہوئی۔ لیکن جب سے اس زبان نے ریاست میں سانس لی ہے تب سے ہی ریاست کے شعراء اور ادباء نے مختلف شعری اور نثری اصناف میں اپنی فنی لیاقتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اہم خدمات انجام دیں۔ اور ادب کی مختلف اصناف کے گیسوں سنوارنے میں فعال کردار ادا کیا۔

ریاست میں ڈوگرا حکومت کے دور میں ایک طرف قدیم لوک فن "بھانڈ پاتھر" نے ڈرامے کو تقویت دینے کا عمل شروع کیا۔ وہیں دوسری طرف ڈرامے کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہوئی، تو رام لیلا اور راس لیلا کے پروگرام بھی ہونے لگے۔ محمد عمر اور نور الٰہی صاحبان کے بعد دینا ناتھ واریکو شاید، محمد دین فوق، اور ماہ جموی وغیرہ جیسے کئی ڈراما نگاروں نے ابتدائی دور میں ڈرامے کی نوک پلک سوارنے کا کام کیا۔ مگر 1947 سنہ کے بعد جب ملک تقسیم ہوا تو اِس خونی منظر نے جہاں زندگی کے مختلف شعبوں کو متاثر کیا۔

وہیں اُردو ادب میں بھی ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ اس المیہ نے عوام میں خوف وخرص، اجنبیت اور بے راہروی وغیرہ جیسے سینکڑوں مسائل کھڑے کر دیے۔ جس کی وجہ سے ناول، افسانہ اور شاعری بھی متاثر ہوئے اور ان کے ساتھ ساتھ اُردو ڈراما بھی متاثر ہوا۔ ڈرامے میں نت نئی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ ایپک تھیٹر اور ابزرڈ تھیٹر وغیرہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ جموں وکشمیر میں اپٹا(IPTA) کی جگہ کلچرل فرنٹ نے لی اور دوسری طرف ریڈیو ڈراما کا بھی سلسلہ جاری تھا۔ اس دور میں کئی ڈراما نگاروں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے، جن کی تفصیل زیل میں ہے۔ تقسیم کے المیے کے بعد جب اپٹا(IPTA) نے کلچر فرنٹ کی شکل اختیار کی تو اسٹیج اور ڈرامے کے لیے راہیں ہموار ہونے لگیں۔ لیکن جلد ہی کلچر فرنٹ، آل اسٹیٹ کانگرس میں تبدیل ہو گیا آل اسٹیٹ کانگرس میں تین شعبے قائم کیے گئے۔ .1 مصوروں کا شعبہ .2 ادیبوں اور شاعروں کا اور .3 تھیٹر کا شعبہ۔

اِس دور کے اہم ڈراما نگاروں کی فہرست میں "پروفیسر محمود ہاشمی" کا نام قابلِ ذِکر ہے۔ ان کا پورا نام سلطان محمود ہے۔ انہوں نے مختلف رسالوں کی ادارت بھی کی، وہ بنیادی طور پر ترقی پسندانہ نظریے کے حامل تھے۔ انہوں نے ابتدائی دور میں "لالا رخ" کے نگران کے فرائض بھی انجام دیے۔ جب آل سٹیٹ کانگرس وجود میں آیا تو انہوں نے " کشمیر یہ ہے' کے عنوان سے ایک ڈراما لکھا جو کافی مقبول ہوا۔ یہ ڈراما مکمل کشمیری فضا کے تحت اسٹیج بھی ہوا۔ اس ڈرامے کو اُردو میں پیش کیا گیا مگر تمام گانے کشمیری میں تھے۔ اس ڈرامے کو ڈاکٹر برج پریمی اور پریمی رومانی نے ریاست میں تھیٹر اور ڈراما کی سنگِ میل قرار دیا۔ اس کے علاوہ ہاشمی نے امتیاز علی تاج کے ڈرامہ "انارکلی" کا جواب "انارکلی کی واپسی" کے عنوان سے دیا تھا۔ ان کے دیگر ڈراموں میں " آنکھ " نے بھی کافی مقبولیت حاصل کی۔

پریم ناتھ پردیسی' جن کی پیدائش 1909ء میں ہوئی۔ ریاست کے پہلے باقاعدہ

افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔انہوں متعدد ڈرامے بھی لکھے جن میں زیادہ تر ریڈیو سے منسلک ہونے کے بعد کے تھے۔ پردیسی کے اہم ڈراموں میں سوالی، سنگتراش، متعصسم کی آخری رات، بھتہ ہر وغیرہ اہم تھے۔ تقسیم کے المیے کے بعد جو فسادات اور خون ریزی کا منظر بھرپا ہوا تو اس دور میں قبائلی حملوں میں مارے گئے "شیروانی" کی زندگی پر ایک ڈرامہ "مجاہد شیروانی" کے عنوان سے بھی لکھا۔ یہ ڈرامہ کلچرل فرنٹ کے شعبہ ڈراما کے اہتمام سے اسٹیج بھی کیا گیا تھا۔

رامانند ساگر' بھی اس دور کے ادیبوں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ مقبول افسانہ نگار ہیں مگر فلموں کے لیے کہانیاں اور مکالمے بھی تحریر کیے۔ کئی فلمیں ایسی تھیں جن میں انہوں نے اداکاری بھی کی جن میں انسانیت اور پیغام خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں۔

وجے سمن سوسن' خط جموں سے تعلق رکھنے والے اہم ادیب تھے جنہوں نے افسانے اور ڈرامے تحریر کیے۔ وہ ایک مقبول اور ممتاز صحافی کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے انگمان کے عنوان سے ایک ڈراما لکھا۔جس کا موضوع ہندوستان پر چین کا حملہ تھا انگمان اس ڈرامے کی مرکزی کردار بھی ہے جو لداخ کی رہنے والی ہے، اور اس کے دو بھائیوں کو چینی آرمی نے شہید کر دیا۔ اس لڑکی کو چینی فوجیوں نے اپنی ہوس کا شکار بنایا، اور اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔جس کو بعد میں پانی میں ڈبو کر انگمان نے مار دیا۔

دیانند کپور' بھی ایک صحافی تھے جنہوں نے ایک ڈراما "تاج" کے عنوان سے لکھا تھا. ان کے بیٹے موتی لال کپور نے بھی ایک مقبول ڈرامہ "حرفِ آخر" کے عنوان سے لکھا تھا۔ جو بعد میں نند گوپال باوا کے مجموعہ میں شائع ہوا۔

دینوں بھائی پنت' جن کی پیدائش 1917ء میں ہوئی۔ اُردو اور ڈوگری زبانوں میں لکھتے

تھے۔ وہ ترقی پسند نظریے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک ڈراما "سورگ کی کھوج " کے عنوان سے تحریر کیا، جس کا موضوع کشمیر کی روایتی لوک کہانی " کشف رشی' کے گرد گھومتا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اس ڈرامے کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

"ڈرامہ عہد کی ملامت، موضوع کی دلکشی اور پیشکشی کے انداز کی وجہ سے ایک نیم کلاسی کی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ڈرامہ کئی دفعہ اسٹیج پر بھی پیش کیا گیا اور 1963 میں ڈوگری سنتھا کی جانب سے شائع ہوا" (عبدالقادر سروری. کشمیر میں اردو جلد۔ ۳)

نرہری رائے زادہ' کا نام بھی ریاست جموں کشمیر میں آزادی کے بعد ڈرامے لکھنے والوں کی فہرست میں اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنے ایک ڈرامے جس کا عنوان " پرانے دیپ نئیاُ جالے " پر کلچرل اکیڈمی سے اِنعام بھی حاصل کیا۔ یہ ڈراما مکمل اسٹیج کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ اور 1965ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ایک مجموعہ " اُردو ڈرامے " کے عنوان سے 1964ء میں شائع ہوا، اس میں ایک محل، ایک پتھر شمع جلاؤ شمع بجاؤ، یادکی پرچھائیں، تاش کا گھر اور پنجرہ کے عنوان سے پانچ ڈرامے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے معتدر ڈرامے لکھے جن میں پرانے خدا نئے لوگ، بہادر شاہ کی آخری رات وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

رام کمار ابرول' ریاست کے ایک اہم ادیب تھے جن کا تعلق پہلے آل انڈیا ریڈیو اور پھر محکمہ اطلاعات سے رہا یہ ڈوگری اور اُردو دونوں زبانوں میں مہارت رکھتے تھے. ابرول کے متعدد ڈرامے شائع اور اسٹیج بھی ہوئے جن میں "انسان جیت گیا" اکافی مقبول ہوا، یہ ڈرامہ 1959ء میں لکھا گیا۔ اس کے علاوہ 1965ء میں دھرتی اور ہم، چکی کے پاٹ، ان کے مقبول ڈراموں کی فہرست میں شامل ہیں۔

نریندر کھجوریا' نے 1964ء میں ایک ڈراموں کا مجموعہ " راستے کا نٹے اور ہاتھ " کے عنوان سے شائع کیا، جس کی مشمولات میں تین ریڈیائی ڈرامے اور ایک اسٹیج ڈراما شامل

تھا۔ زیڈ سیمی' کا نام بھی ڈراما نگاری کی اِس فہرست کا حصہ ہے۔ ان کا ایک ڈراموں کا مجموعہ "چھنکار" کے عنوان سے منظر عام پر آیا، اس کے علاوہ ایک مقبول ڈرامہ "جہانگیر کی موت" بھی 1962ء میں شایع ہوا۔

بینی نردوش' جو شیام لال تیرت کشمیری کے بیٹے تھے ریڈیو کشمیر میں ملازمت کرتے تھے۔ ان کے متعدد ریڈیو ڈرامے نشر ہوئے اور اس کے علاوہ مختلف رسالوں کی زینت بھی بنے "ایک رات کا مہمان" ان کا مشہورِ زمانہ ریڈیائی ڈراما ہے۔

پشکر ناتھ جن کی پیدائش 1932ء میں ہوئی۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے مقبول ہوئے۔ انہوں نے کئی ڈرامے بھی تحریر کیے۔ جن میں ساون چلے بھادوں چلے، دل کی وادیاں، ایک لکیر درد کی اور ڈیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

علی محمد لون کشمیری زبان کے منجھے ہوئے ادیب جن کا ایک کشمیری ڈراما "سیاہ" کافی مقبول ہوا. انہوں نے اُردو میں بھی متعدد ڈرامے تحریر کیے. جن میں خالو جان کا خواب، چٹان، گھروندے اور دیوانے کا خواب، قابل ذکر ہیں۔

نور شاہ' کا نام اس فہرست میں کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے ناول، افسانہ اور ڈراما تینوں میدانوں میں شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ ان اہم ڈراموں میں سفر زندگی کا، ویرانے کے پھول، دل کی بستی، ویل چیئر، چاند پھول، اور وادیاں خاموش ہیں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سجود سیلانی' ریاست جموں و کشمیر کے ڈرامہ نگاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں، ان کے ڈراموں کا مجموعہ شاہکار" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس میں پانچ مشمولات ہیں اس مجموعے کا حرفِ اول ڈاکٹر شکیل الرحمن نے لکھا۔ اس مجموعے میں شامل ڈراما "مجنوں کا مقدمہ" ایک طنزیہ ڈراما ہے، اس کے علاوہ 1999ء میں شائع ہونے والا ڈراما "جل ترنگ" تین ایکٹوں پر مشتمل بھی اہمیت کا حامل ہے۔

ان تمام ڈراما نگاروں کے علاوہ ریاست جموں وکشمیر میں سینکڑوں ڈراما نگاروں نے اپنے قلم اور تخیل کے جوہر دکھائے اور حال میں بھی یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ایسے تمام ڈراما نگاروں جن کا تفصیل سے ذکر کرنا یہاں ممکن نہیں، اُن میں ورِیندر پٹواری، پرویز ملک، بشیر شاہ، جوگندر سنگھ سدھن، سی پروانہ، ہیرا لال کول کافر، پروفیسر ظہور الدین، ریاض معصوم قریشی، مشتاق مہدی، شیام سُندر آنند (آنندلہر)، انیس ہمدانی، ڈاکٹر عزیز حاجنی، محمد امین بھٹ، اشرف عادل، راجہ یوسف، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ ریاست میں جن اداروں نے ڈراما اور تھیٹر کی ترویج وترقی میں اہم رول ادا کیا ان میں ریڈیو کشمیر سری نگر، جس کا قیام 1948ء میں عمل میں آیا، نے سینکڑوں ریڈیائی ڈراموں کو نشر کیا۔ ریاستی کلچرا کیڈمی 1958ء نے بھی ڈراما کی تحریک کو تقویت دینے میں اہم رول ادا کیا۔ان اداروں کے علاوہ دوردرشن سرنگر بھی قابل ذکر ہے۔

مجموعی طور پر ریاست میں ڈراما اور تھیٹر کی تحریک 1947ء سے لے کر حال تک روشن نظر آرہی ہے، اگرچہ دبستانِ جموں وکشمیر میں ڈرامے کا آغاز دوسری اصناف کے مقابلے میں سُست رفتاری سے ہوا تھا، مگر اب یہ رفتار بلندیوں کی طرر رواں دواں ہے اور انشاءاللہ مستقبل میں بھی جاری وساری رہے گی۔

کتابیات:

کشمیر میں اردو (دوسرا حصہ)	عبدل قادر سروری	1982ء
کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)	عبدل قادر سروری	1984ء
جموں کشمیر میں اردو ادب کی نشونما۔	ڈاکٹر برج پریمی	2013ء(4th Edition)
1947ء کے بعد اردو ڈراما	محی الدین قادری زور	2013ء

Firaq ki Shairi mein Hindustani Anasir : Ek Jaeza by Shabnam Ansari

(Research Scholar, dept. of Urdu BHU , Varanasi) cell- 9936824335
شبنم انصاری (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی)

فراقؔ کی شاعری میں ہندوستانی عناصر: ایک جائزہ

فراقؔ گورکھپوری کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جن کی شاعری روایت سے مستحکم رشتہ رکھنے کے باوجود حیرت انگیز نیا پن رکھتی ہے۔ انھوں نے غزل، نظم اور رباعی تینوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں اپنی فکری و فنی ہنرمندی کے دلفریب نقوش چھوڑے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر فراقؔ غزل کے شاعر ہیں اور غزل ہی ان کی شعری کائنات کا جزوِ غالب ہے جس سے وہ جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

فراقؔ کئی اعتبار سے ایک امتیازی شخصیت کے مالک ہیں جو علمی وقار، نقادانہ بصیرت اور متعدد زبانوں پر مہارت رکھتے تھے۔ عموماً اردو کے قدیم شعراء کا دائرۂ علم عربی اور فارسی تک ہی محدود رہتا تھا لیکن فراقؔ نے عربی، فارسی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندی اور سنسکرت زبان و ادب سے بھی استفادہ کیا ہے جس کا اثر ان کی پوری شاعری پر نمایاں ہے۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں:

''میرے یہاں تو صرف اردو کے شعرا ہی نہیں بلکہ ہندی ادب و کلچر اور مغربی ادب و کلچر سب مل جل کر کارفرما ہیں۔'' [۱]

اردو شاعری اور ادب میں ہندوستانی تہذیب سے دلچسپی کی روایت پہلے سے موجود ہے جس کی ارتقائی شکل فراقؔ کی شاعری ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فراقؔ نے اس موضوع کا حق ادا کر دیا ہے اور ہندوستان کی تمام چیزوں سے محبت اور تعلق کو اپنی شاعری کا ایک اہم موضوع بنا دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''اردو ادب و شاعری میں ہندوستانیت اور بلند ترین ہندوستانیت اسی طرح کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے جیسے جرمن ادب میں جرمنیت، روسی ادب میں روسیت اور حجازی ادب میں حجازیت یا بھوبھوتی اور کالیداس، بھرتری ہری اور ٹیگور کی شاعری اور پریم چند کے ادب میں ہندوستانیت۔'' ۲

فراقؔ نے اردو ادب میں پہلی بار بلند آہنگی اور جمالیاتی احساس کے ساتھ ہندوستانی تہذیب و مذہب، فکر و فلسفہ، فنونِ لطیفہ، لوک گیت اور ہندوستانی عورتوں کے خدوخال اور جذبات و احساسات کو اپنی شاعری اور تنقید کا موضوع بنایا ہے اور اس کو فکری وفنی توانائی عطا کی ہے۔ فراق کی شاعری چاہے نظم ہو، غزل ہو یا رباعی ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان میں ہندوستانی عناصر کی بھرپور عکاسی ہے۔ ان کی شاعری میں ہندوستانیت کی جو فضا ہے وہ صرف دیومالاؤں اور اساطیری داستانوں سے اخذ کردہ تشبیہات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ انھوں نے ہندوستانیت کو اس کے وسیع مفہوم میں اپنایا ہے۔ وہ ہندوستان کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن، معاشرت، سماجی نظام، مناظر فطرت، ہندو مذہب و فلسفہ اور تہذیبی اقدار کو آئیڈیل قرار دیتے ہیں اور اپنے شعر و ادب کو اس کا ترجمان بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے انھیں گوناگوں عناصر کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری دوسروں سے منفرد نظر آتی ہے۔

فراقؔ کی نظموں اور رباعیوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا ہے کہ نظموں کے پیرائے میں انھوں نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور معاشرت کو جس خوبی اور انداز سے پیش کیا ہے وہ قابلِ فخر ہے۔ ان کی نظمیں خصوصاً ''جگنو'' اور ''ہنڈولہ'' ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ نظم ''جگنو'' میں فراقؔ نے جو منظر بیان کیا ہے وہ پورے ہندوستان کا منظر معلوم ہوتا ہے اور نظم ''ہنڈولہ'' میں ہندوستان کے مختلف ادوار کی تہذیبی تاریخ کا بیان کیا ہے جس میں تاریخی حیثیت کے حامل موہن

جوداڑوا اور ہڑپا، جو کہ ہندوستان کے عہد قدیم کا ثقافتی ورثہ ہیں، انھیں بھی نظم کا حصہ بنایا ہے اور قدیم ہندوستان کی ایک اہم یادگار اجنتا ایلورا کا بھی ذکر کیا ہے جو ہندوستان کی ثقافت، فنِ تعمیر اور طرزِ معاشرت کی خوب صورت نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اس نظم میں ان شخصیات کا بھی ذکر کیا ہے جو اس ملک کے وقار کو دوبالا کرتی ہیں اور ہندو دیوی دیوتاؤں کا بھی تذکرہ اس نظم میں موجود ہے۔ اس طرح یہ نظم ہندوستان کی ثقافت، تاریخ اور تہذیب کو نمایاں کرتی ہے۔ مثال کے طور پر نظم ''ہنڈولہ'' کا یہ حصہ پیش ہے:

اسی زمین پہ کھیلا ہے رام کا بچپن
اسی زمین پہ ان ننھے ننھے ہاتھوں نے
کسی سمے میں دھنش بان کو سنبھالا تھا
اسی دیار میں دیکھی ہے کرشن کی لیلا
یہیں گھروندوں میں سیتا، سلوچنا، رادھا
کسی زمانے میں گڑیوں سے کھیلتی ہوں گی
یہی زمیں، یہی دریا، یہی پہاڑ، جنگل، باغ
یہی ہوائیں، یہی صبح و شام، سورج، چاند
یہی گھٹائیں، یہی برق و رعد و قوس و قزح
یہیں کے گیت، روایات، موسموں کے جلوس
ہوا زمانہ کہ سدھارتھ کے تھے گہوارے
انہی میں آنکھ کھلی تھی اشوک اعظم کی
انہی نظاروں میں بچپن کٹا تھا وکرم کا
سنا ہے بھرترہری بھی انہیں سے کھیلا تھا
بھرت، اگست، کپل، ویاس، پاشی، کوٹلیہ

جنک وششٹ، منو، والمیک، وشوامتر
کناد، گوتم و رامانج، کمارل بھٹ
مہنجوداڑو، ہڑپا کے اور اجنتا کے
بنانے والے یہیں بلموں سے کھیلے تھے
اسی ہنڈولے میں بھبھوت و کالیداس کبھی
ہمک ہمک کے جو تتلا کے گنگنائے تھے

فراقؔ نے اپنی رباعیات میں بھی آسان زبان میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی رباعیات کا مجموعہ ''روپ'' ان کی ہندوستانیت کی بہترین مثال ہے۔جس میں ہندوستان اور فطرت سے قربت کا احساس، عورت کا جلال و جمال، یہاں کے رسم ورواج، گنگا جمنی تہذیب اور طرز معاشرت کو دیکھا جاسکتا ہے۔مثال کے طور پر فراقؔ کی رباعی کے چند اشعار پیش ہیں جو ان کی ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے وابستگی اور روایتی رباعیات میں بھی نئے پن کا احساس دلاتے ہیں۔ملاحظہ ہو ؎

تہذیب کی پہلی صبح کی پاک دعائیں
گونجی ہوئی فضا میں رشیوں کی صدائیں
اے گنگ و جمن کی گنگناتی لہروں
دیتی ہے سنائی تم میں ویدوں کی رچائیں

فراقؔ نے کچھ رباعیات کو 'مادرِ ہند' کے نام سے لکھا ہے۔''مادر ہند'' کی رباعیات میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو انھیں ایک روایتی اور تقلیدی رباعی گو سے الگ کرتی ہیں۔'مادرِ ہند' کے حوالے سے نوازش علی لکھتے ہیں:

''مادر ہند کی رباعیات میں فراقؔ نے ہندوستان کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔۔۔۔۔۔ہندوستانی تہذیب، مناظر فطرت، ہندوستانی علوم، ہندوستان کی موسیقی

اور رقص ان سب کے ذکر سے شاعر نے اپنے وطن کی عظمت کو واضح کیا ہے اور اپنی دھرتی سے اپنے قلبی تعلق کو ظاہر کرتے ہوئے اسے 'جگت ماتا' کہا ہے۔ اس طرح کی رباعیاں کہنا اور ہندوستان کی روحانی اور ثقافتی تہذیب اور تاریخ کو رباعیوں کی شکل میں دے دینا ایک نازک اور مشکل کام ہے۔ جو فراقؔ نے کر دکھایا ہے۔'' ۳

گہرا ہر قوم سے تیرا ناتا ہے ہم پر ہی ماں تجھے پیار آتا ہے
اوروں کا بھی حق ہے مامتا پر تیری سنتے ہیں تیرا نام جگت ماتا ہے

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب اردو شاعری کلاسیکیت، رومانیت، اصلاح پسندی، ترقی پسندی اور انقلابیت کے حوالے سے کشمکش کی شکار تھی تب ایسے وقت میں فراقؔ نے اردو شاعری کو ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے اظہار کی طرف موڑنے کی شعوری کوشش کی اور ایک نئی طرح کی شاعری کی داغ بیل ڈالنے میں کامیابی بھی حاصل کی۔ فراقؔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے علمبردار رہے اور وہ اس پر نہ صرف فخر محسوس کرتے ہیں بلکہ اس کی حفاظت اور بقا کے لئے مستقل فکرمند رہا کرتے تھے۔ لہٰذا اردو شاعری میں ہندو دیو مالاؤں، اساطیری داستانوں اور ہندوستانی عناصر کی نمائندگی فراقؔ کی ایک بہت بڑی دین ہے جس کے لئے اردو زبان ہمیشہ ان کی شکر گزار رہے گی۔

حواشی:

1۔ بحوالہ فراق گورکھپوری: شخصیت اور فن از نوازش علی مشمولہ زمانہ کانپور ۱۹۴۰، ص: ۲۸۴ (۲۵۴)

2۔ عرض مصنف از فراقؔ گورکھپوری: شبنمستان (کلیاتِ فراقؔ) جلد۔ ۲، ۱۹۶۵

3۔ فراقؔ گورکھپوری: شخصیت اور فن از نوازش علی، دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۳، ص: ۴۷۵

☆☆☆

Sociolinguistic Approach to Language Learning by Imteyaz Ahmad

(Research Scholar, dept. of Educational Studies, Faculty of Education

jamia Millia Islamia (New Delhi) cell-9911752717

امتیاز احمد (ریسرچ اسکالر شعبۂ تعلیمی مطالعات، فیکلٹی آف ایجوکیشن جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

زبان کی آموزش کا سماجی لسانیاتی نقطۂ نظر

تعارف:

عصرِ حاضر میں زبان کی تدریس اور آموزش کے تعلق سے نت نئے تجربات اور نظریات ابھر کر سامنے آرہے ہیں۔ زبان کی آموزش کو طلبہ کے مختلف تناظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ طلبہ کی سماجی پس منظر، لسانی سیاق و سباق اور نفسیاتی پہلوؤں کو اہمیت دی جارہی ہے۔ چونکہ زبان معلومات کی ترسیل، تہذیب وثقافت کی تربیت اور شناخت کے قیام میں اہم کردار ادا کرتی ہے، اس لیے اب اس کی جملہ جہات کو مدنظر رکھ کر زبان کی تدریس اور آموزش کی وکالت کی جارہی ہے۔ طلبہ کی گھریلو زبان اور اسکولی زبان میں مطابقت قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ زبان کے اساتذہ زبان کے سماجیاتی کردار اور علاقائی تفاوت سے اچھی طرح واقف ہوں۔

زبان اور سماج کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ انسانی معاشروں میں خیالات وجذبات اور معلومات کی باہمی تبادلہ اور ترسیل میں زبان اہم ترین ذریعہ تصور کی جاتی ہے۔ انسان اس کے ذریعے دوسروں تک محض اپنے خیالات اور جذبات ہی نہیں پہنچاتا بلکہ وہ جو زبان بولتا ہے اور جس انداز میں کوئی زبان اختیار کرتا ہے، اس کے ذریعے وہ اپنے بارے میں اور بھی بہت سی معلومات دوسروں تک غیر شعوری طور پر پہنچا دیتا ہے جو اس کی اور اس کے علاقے کی شناخت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ طلبہ کے سماجی پس

منظر کیا ہے؟، وہ کہاں کے رہنے والے ہیں اور اس کے خاندان کا ذریعۂ معاش کیا ہے، اس کا اچھا خاصا سراغ ان کی گفتگو سے معلوم ہو جاتا ہے۔ ہر زبان رفتہ رفتہ تبدیلی اور تغیر کے منازل سے گرزتی رہتی ہے اور ایک ہی زبان مختلف علاقوں اور طبقوں میں تھوڑے بہت فرق اور اختلاف کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ یہ فرق اپنے بولنے والوں اور ان کے سماجی پس منظر کے متعلق بہت کچھ بتاتا ہے۔ اسی سماجی پس منظر اور زبان کے باہمی تعلقات کو سمجھنا سماجی لسانیات کا کام ہے۔

سماجی لسانیات: تعریف: سماجی لسانیات (Sociolinguistics) لسانیات کی ایک شاخ ہے جسے سب سے پہلے کیمبرج کے ماہرِ علمِ بشریات طامس ہوڈسن (Thomas Hodson) نے 1939 میں متعارف کیا۔ سماجی لسانیات سماج اور زبان کے تعلق کا سائنسی مطالعہ پیش کرتی ہے۔ سماجی لسانیات کے مفروضات کا جائزہ لیا جائے تو یہ تصور بھی ابھرتا ہے کہ سماجی لسانیات بذاتِ خود کوئی علمی شعبہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک بین العلومی تصور ہے۔ اس کا دائرہ سماج ہی کی طرح وسیع ہے۔ اس میں سماج اور زبان کے باہمی تعلق کا مطالعہ جن وسائل کے ذریعے کیا جاتا ہے، وہ خاصے متنوع ہیں اور ان وسائل میں علاقائی وجغرافیائی ماحول، معاشی طبقات، پیشے، دولسانیت اور کثیر لسانیت بھی شامل ہیں۔ اسی طرح سماجی لسانیات کے مطالعاتی دائرے میں برادریاں، فرقے، مقامات، گھر، دفاتر، ادارے، نسلی تفاوت اور نسلی شناخت کے مسائل، معاشی حالات، صنفی تفاوت، لسانی شناخت کے مسائل اور زبان پر تعلیم کے اثرات بھی شامل ہیں۔ مختلف ماہرینِ سماجی لسانیات نے اس کی تعریف بیان کی ہیں۔ جینیٹ ہولمز (Janet Holmes) سماجی لسانیات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سماجی لسانیات کے ماہرین زبان اور معاشرے کے درمیان تعلق کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ مختلف معاشرتی سیاق وسباق میں زبان کے مختلف استعمال، اس کے معاشرتی افعال اور معاشرتی معنی کے اظہار کے طریقوں پر زور دیتے ہیں۔ مختلف سماجی سیاق وسباق میں

لوگوں کے لسانی استعمال کے طریقوں کا تجزیہ زبان کے افعال کی معلومات کے ساتھ ساتھ ایک کمیونٹی کے سماجی تعلقات اور لوگوں کا زبان کے ذریعے اپنی سماجی شناختی پہلوؤں کے اظہار اور تعمیر کے طریقوں کے متعلق بہت ساری معلومات فراہم کرتا ہے''۔

پیٹر ٹروڈجل (Peter Trudgill) نے سماجی لسانیات کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سماجی لسانیات لسانیات کی ایک شاخ ہے جو زبان کو ایک سماجی اور ثقافتی مظہر کے طور پر مطالعہ کرتی ہے۔ یہ زبان اور معاشرے کے تعلقات کی تحقیقات کرتی ہے اور سماجی علوم بالخصوص معاشرتی نفسیات، بشریات، انسانی جغرافیہ اور سماجیات سے خاص تعلق رکھتی ہے''۔

رونالڈ وردھاگ (Ronald Wardhaugh) نے سماجی لسانیات کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

''سماجی لسانیات کا تعلق زبان اور معاشرے کے درمیان تعلقات کی تحقیقات سے ہے جس کا مقصد زبانوں کے مواصلاتی افعال کے طریقوں اور اس کی ساخت کی بہتر تفہیم ہے''۔

یاسمین بیورٹ (Yasemin Bayyurt) نے سماجی لسانیات کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہیں:

''سماجی لسانیات کو سائنسی شعبہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جو معاشرے میں زبان کے مقاصد اور افعال کی تحقیقات کرتا ہے۔ یہ جغرافیائی سرحدوں کے تناظر میں زبان کے ایک سیاق وسباق سے دوسرے سیاق وسباق میں تبدیلی وتغیر اور ایک پس منظر کے افراد کا دوسرے پس منظر کے افراد کے ساتھ بات چیت اور مواصلات کے تفاوت اور امتیاز کی وضاحت کرتا ہے''۔

ایڈورڈ فائنگن (Edward Finegan) نے سماجی لسانیات کی مفصل تعریف بیان کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''سماجی لسانیات زبان کے سماجی استعمال کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کو مرکز ومحور زبان اور معاشرے کے درمیان تعلقات ہوتے ہیں اور اس کے بنیادی مقاصد سماجی گروہوں اور مواصلاتی حالات میں مرد اور خواتین کے لسانی فرق کی شکل اور افعال کو اجاگر کرنا ہے۔ حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ سماجی لسانیات کے ماہرین روزمرہ زندگی کے تعاملات میں زبان کی تعمیر و از سرِ نو تعمیر، تشکیل و از سرِ نو تشکیل اور سماجی حقائق کی عکاسی وتخلیق میں زبان کے کردار کا جائزہ لیتے ہیں''۔

مذکورہ بالا تعریفات سے واضح ہوتا ہے کہ سماجی لسانیات زبان اور سماج کے درمیان تعلقات کے سائنسی مطالعے سے سروکار رکھتی ہے۔ یہ زبان پر سماج اور طبقات کے اثرات مثلاً خواتین اور مرد اور پڑھے لکھے اور ان پڑھوں کی زبان کے اختلافات کا تجزیہ کرتی ہے۔ یعنی انسان کی سوچ، معاشرے اور ماحول کا زبان پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، سماجی لسانیات اس کا مطالعہ کرتی ہے۔ نیز سماجی لسانیات لسانی فرق (Language Variation)، لسانی تغیر (Language Change) اور لسانی تنوع (Language Variety) کو اپنے مطالعے کا محور ومرکز بناتی ہے۔

زبان کی تدریس اور آموزش کے دوران اس کی متنوع خصوصیات اور سماجی سروکار کو مدنظر رکھنا ازحد ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ زبان سیکھنے کے تعلیمی مقاصد کو حاصل کرنے میں اور اس کے کردار کو اچھی طرح سمجھنے میں ہمیں آسانی فراہم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کی تدریس اور آموزش میں سماجی وثقافتی سیاق وسباق، لسانی تغیرات، زبان کے حصول کے عمل کا وسیع علم، بچوں کی نفسیات، غیر ملکی زبان کی تدریس کی تدابیر اور جانچ وتشخیص کے طریقوں کا مخصوص علم خاص طور پر اہم ہو گیا ہے۔ آج کے موجودہ دور میں ہم زبان کے کردار سے نہ صرف رابطے کے ذریعہ بلکہ سماجی شناخت کی تعمیر کے توسط سے بھی واقف ہو گئے ہیں۔ سماجی لسانیات اساتذہ کے لیے زبان کا ایک دلچسپ اور اہم شعبہ بن گیا ہے کیونکہ یہ روزمرہ زندگی میں انسانوں کے ذریعہ زبان کے مختلف استعمال

سے بحث کرتی ہے۔نینسی ایچ۔ ہورن برگر اور سینڈرا لی میکائے (Nancy H. Hornberger and Sandra Lee Mcky) نے زبان کی تدریس میں سماجی لسانیات کی اہمیت کے حوالے سے لکھا ہے:

''اساتذہ کا سماجی لسانیات کی خاص سمجھ ہونی چاہیے تا کہ ان کو زبان کی تدریس میں مدد مل سکے اور زبان سیکھنے کے عمل کو اچھی طرح سے نافذ کیا جا سکی۔ سماجی لسانیات بہت سارے طریقوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اساتذہ کو ہر آموزگار کی زبان اور سماجی پس منظر کو اچھی طرح جاننا چاہیے تا کہ زبان سکھانے کے لیے مناسب طریقہ کار کا انتخاب کیا جا سکے۔ زبان سیکھنے کے لیے سماجی لسانیات کے نقطہ نظر کا ایک مرکزی مسئلہ قومیت کا جذبہ بھی ہے''۔

مختلف تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اساتذہ اکثر زبان کی تدریس میں سماجی لسانیات کے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ مادری زبان کی تدریس کے دوران دوسری یا غیر ملکی زبان کے الفاظ، قوائد اور تلفظ سیکھانے پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ سماجی لسانیات کے تناظر میں زبان سیکھنے اور بولنے والوں کو یہ فرق کرنے میں مدد ملتی ہے کہ وہ کہاں، کس سے؟ کس طرح اور کب بات کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اساتذہ کو چاہیے کہ وہ تدریسی مواد کو معاشرتی سیاق و سباق سے جوڑنے کی مہارت سے واقف ہوں۔ جب ہم زبان کی تعلیم کے سلسلے میں مختلف نظریات اور تصورات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ پاتے ہیں کہ زبان کی تدریس اور آموزش کے حوالے سے مختلف ماہرینِ لسانیات، نفسیات اور تعلیم داں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

سماجی لسانیات کا زبان کی تعلیم میں ایک خاص کردار ہے۔ اس لیے استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ زبان کے تدریسی مواد کو سماجی لسانیات کے ذریعہ پیش کرے تا کہ طلبہ کو زبان اور سماجی تناظر کے درمیان تعلق کا علم ہو سکے۔ ہر ایک طالب علم زبان کو مختلف سیاق و سباق میں مختلف افعال کے لیے استعمال کرتا ہے۔ استاد کو زبان کی تدریس میں زبان کے استعمال سے منسلک تمام پہلوؤں کا بخوبی علم ہونا چاہیے خواہ وہ بولی جانے والی

زبان ہو یا پھر تحریری زبان ہو۔ استاد زبان کی آموزش کو سماجی سیاق وسباق کے مطابق بنا کر زبان پر معاشرتی اور ثقافتی عوامل کے اثرات کا باقاعدہ جائزہ لے سکتا ہے اور ایک خاص نقطہ نظر کے ساتھ اپنی معاشرتی اور لسانی بیداری میں بھی اضافہ کر سکتا ہے۔

زبان کی آموزش کے متعلق وائی گوٹسکی کا نقطہ نظر:

Leh Vygotsky Approach to Language Learning

وائی گوٹسکی کی پیدائش 1896 میں روس میں ہوئی۔ ان کا انتقال محض 37 سال کی عمر میں ہوا۔ کم عمری میں موت کی وجہ سے ان کے زیادہ تر نظریات پوشیدہ رہ گئے ہیں۔ حالانکہ ان کے کچھ تحریروں کا روسی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان کا یہ خیال رہا ہے کہ سماجی تعامل بچوں کی تعلیم میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس طرح معاشرتی تعاملات کے ذریعہ بچے سیکھنے کے ایک مسلسل عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ ان کے مطابق زبان معاشرتی تعامل سے تیار ہوتی ہے۔ زبان بچوں کی شخصیت کے نشوونما کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ ان کے مطابق ابتدائی طور پر ایک شیر خوار بچے میں فکر اور زبان الگ الگ ہوتے ہیں، لیکن تقریبا (۳) تین سال کی عمر ہوتے ہوتے بچے کی زبان اور فکر ایک دوسرے پر انحصار کرنے لگتے ہیں۔ وائی گوٹسکی نے زبان کی تین شکلوں کے بارے میں گفتگو کی ہے، جس کو حسب ذیل طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

سماجی تقریر (Social Speech): وائی گوٹسکی کے مطابق دو سال کی عمر سے بچہ دوسروں سے باتیں کرنے کے لیے جس زبان کا استعمال کرتا ہے، وہ بچے کا سماجی تقریر ہوتا ہے، جسے وہ لوگوں سے سن کر اخذ کر کے سیکھتا ہے۔

نجی تقریر (Private Speech): وائی گوٹسکی کے مطابق تین سال کی عمر سے بچہ اچھی طرح سے خود کلامی کرنے لگتا ہے، جو اس بچے کا نجی تقریر کہلاتا ہے۔

خاموش اندرونی تقریر (Silent Inner Speech): وائی گوٹسکی کے مطابق سات سال کی عمر سے بچہ خاموش اندرونی تقریر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یعنی عمر

کے اس حصے میں بچہ خاموشی سے خود سے کلام کرتا رہتا ہے۔

اس کے علاوہ وائی گوٹسکی نے بچے کے سیکھنے اور سیکھانے کے عمل کو سمجھاتے ہوئے قرب نشوونما کا علاقہ (Zone of proximal Development) کی بات بھی کی ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ طالب علم کسی کی مدد کے بنا کیا سیکھ سکتا ہے اور ایک ہنر مند ساتھی کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے ساتھ وہ کیا حاصل کر سکتا ہے۔ وائی گوٹسکی کا یہ خیال تھا کہ جب ایک طالب علم کسی خاص کام کے لیے قرب نشوونما کے علاقہ میں ہوتا ہے تو ماہرین کی مناسب مدد (Scaffolding) نہ صرف طالب علم کی حوصلہ افزائی کرتی ہے بلکہ اس خاص کام کو مؤثر طریقے سے پورا کرنے میں مدد بھی کرتا ہے۔ وائی گوٹسکی کے مطابق اس خاص کام کو پورا کرنے کے لیے ماہرین تعلیم کو مندرجہ ذیل تین اہم اجزا پر توجہ مرکوز کرنا چاہیے۔

رہنمائی کرنے والے/ استاد کا آموزگار/ طالب علم سے زیادہ علم اور مہارت کا حامل ہونا لازمی ہے۔ یعنی سکھانے والے کو اچھی صلاحیت کا مالک ہونا چاہیے تا کہ وہ طالب علم کی اچھی طرح رہنمائی کر سکے اور سیکھنے کے عمل کو بہتر اور موثر طریقے سے پورا کیا جا سکے۔ استاد ایک اچھا سماجی تعامل پیدا کرنے والا اور زبانی ہدایات فراہم کرنے والا ہو تا کہ وہ طلبہ کی مکمل طور سے رہنمائی کر سکے اور ان کی آموزشی عمل کو بہتر اور مؤثر طریقے سے پورا کیا جا سکے۔ قرب نشو ونما کے علاقہ کے تحت طلبہ کو مؤثر طریقے سے کام پورا کرنے کے لیے جو سہارا دیا جاتا ہے، وہ صرف ایک ماہر استاد کے ذریعہ ہی ممکن ہے تا کہ اچھی طرح سے طالب علم کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ اس کام کو دلچسپی کے ساتھ پورا کر سکے۔

زبان کی آموزش کے متعلق باسل برنارڈ برنسٹین کا نقطہ نظر

Basil Bernard Bernstein Approach to Language Learning

باسل برنارڈ برنسٹین کی پیدائش 1 نومبر 1924 کو لندن کے ایک یہودی گھرانے میں ہوئی۔ وہ ایک مشہور برطانوی ماہر عمرانیات تھے جو تعلیم اور سماجیات میں

اپنے کام کے لیے کافی مشہور ہوئے۔انہوں نے سماجی لسانیات، سمانی تنظیم اور بولنے کے انداز کے درمیان تعلقات پر کام کیا ہے جو زبان کے استعمال میں پائی جانے والی فرق کو بتاتا ہے۔انہوں نے ہمارے بولنے کی عادت اور ہمارے معاشرے پر اس کے اثرات کو واضح کیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنا یہ خاص تجربہ پچھڑے اور متوسط طبقہ کے دولڑکوں پر کی جن کی عمر پانچ (۵) سال تھی۔انہوں نے ان بچوں کو چار تصویریں دیکھائی اوران تصویروں کے بنیاد پر تصویر کے پیچھے چھپی ہوئی کہانی بیان کرنے کو کہا۔انہوں نے اپنے اس تحقیق کے بنا پر زبان کے متعلق اپنا ایک خاص نظریہ پیش کیا جسے محدود کوڈ اور تفصیلی کوڈ (Restricted Code and Elaborated Code) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

محدود کوڈ (Restricted Code)۔محدود کوڈ ایک قسم کی مختصر تقریر ہے۔ اس کا استعمال عام طور پر دوستوں، خاندان والوں، محنت کش طبقہ کے لوگوں اور شادی شدہ جوڑوں کے درمیان دیکھنے کو ملتا ہے۔اس کے تحت بات چیت کرنے والوں کے درمیان ایک باہمی مفاہمت دیکھی جاتی ہے۔ یہ لوگ عام طور پر اپنی گفتگو میں مقامی زبان، سادہ جملے، مختصر الفاظ، محاورے اور فقرے کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ زبان بنیادی طور پر معاشرے کے پچھڑے/ پسماندہ طبقے میں پائی جاتی ہے۔محدود کوڈ ان حالات کے لیے تفصیلی کوڈ سے بہتر کام کرتا ہے جس میں مقررین کے گروپ میں بہت زیادہ مشترکہ اور قابل قبول علم موجود ہو۔

تفصیلی کوڈ (Elaborated Code): باسل برنارڈ برنسٹین نے یہ دعوی کیا ہے کہ تفصیلی کوڈ کا استعمال بنیادی طور پر متوسط اور اعلیٰ طبقے کے لوگ کرتے ہیں۔ یہ لوگ تفصیلی کوڈ کے ذریعے گفتگو کے دوران زیادہ طویل الفاظ، پیچیدہ جملے، ہمہ گیر زبان اور تفصیلی بیانات کا استعمال کرتے ہیں۔ان کا ماننا تھا کہ برطانیہ کے تعلیمی نظام میں زیادہ تر تفصیلی کوڈ کا استعمال ہوتا ہے۔

زبان کی آموزش کے متعلق ولیم لبوو کا نقطہ نظر

William Labov Approach to Language Learning

ولیم لبوو کی پیدائش 4 دسمبر 1927 کو پوسِک، نیو جرسی کے ایک نہایت ہی معزز گھرانے میں ہوئی۔ ان کا انتقال 17 دسمبر 2024 کو پھلو دیلپھیا، پینسلوینیا میں ہوا۔ یہ ایک مشہور امریکی ماہر لسانیات تھے۔ لبوو یونیورسیٹی آف پینسلوینیا کے شعبۂ لسانیات میں بطور پروفیسر ملازم تھے۔ انہیں تغیر پسند سماجی لسانیات کے نظریہ ساز سمجھا جاتا ہے۔ ان کا زیادہ تر کام سماجی لسانیات، زبان کی تبدیلی وتغیر اور جدلیاتی تحقیق سے جڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے تمام تحقیقات کو جمع کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ زیادہ تر لوگ ایک مخصوص بیانیہ کی ساخت کی پیروی کرتے ہیں۔ بیانیہ کے تجزیہ میں وہ سماجی لسانیات کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ زبان لوگوں کے درمیان کیسے کام کرتی ہے۔ ولیم لبوو مقداری سماجی لسانیات کے لیے بھی کافی مشہور ہیں جو بنیادی طور پر زبان کے تغیر اور تبدیلی کے مطالعے سے تعلق رکھتی ہے۔ لبوو کے مفروضے کا مقصد سماجی عوامل کی شمولیت سے تمام لسانی تغیرات کی وضاحت کرنا ہے۔ ان کا مطالعہ لسانی تغیرات، سماجی طبقات اور سماجی ڈھانچے کے مابین رشتے کو واضح کرتا ہے۔ اس مناسبت سے انہوں نے اپنے سماجی لسانی ماڈل کے ذریعہ زبان کے لیے ایک خاص سماجی نقطہ نظر کی سفارش کی جس میں لسانی نظریہ کو معاشرے سے جوڑا گیا ہے۔

ولیم لبوو نے زبان کے سماجی استعمال اور اس میں پائے جانے والے تلفظی تغیرات کو سمجھنے کے لیے دو تحقیق انجام دیا۔ ایک تحقیق نیو انگلینڈ سے تین میل دور Martha's Vineyard جزیرے کی برادری پر انجام دیا جس میں انہوں نے 'اَو' اور 'آئی' مثلاً House، Out، Trout اور While، Pie اور Might کے تلفظ کا جائزہ لیا۔ انہوں نے دوسری تحقیق حرفِ آر (R) کے تلفظ کے جائزے کے لیے نیو یارک شہر کے تین جنرل اسٹور Fifth Avenue siks، Macy's اور S. Klein کے

ملازمین پر انجام دیا۔ لبوو نے اپنے دونوں تحقیقی مطالعات کی معطیات سے یہ نتائج اخذ کیا کہ تلفظ کے فرق میں سماجی عوامل جیسے عمر، برادری، تہذیب، پیشہ اور جائے سکونت بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے یہ بھی تصور دیا کہ زبان کے تئیں حساسیت اور لگاؤ بھی معیاری تلفظ اور غیر معیاری تلفظ کو جنم دیتا ہے۔

زبان کی آموزش کے متعلق پیٹر ٹروڈجل کا نقطہ نظر

Peter Trudgill Approach to Language Learning

برطانوی ماہر سماجی لسانیات پیٹر ٹروڈجل نے ناروچ شہر کے مطالعہ کی روشنی میں زبان اور اس کے تغیر اور استعمال کا نظریہ دیا۔ انہوں نے ایک ہی علاقے میں بولی جانے والی کسی ایک زبان کی مختلف شکلوں کے پیچھے سماجی درجہ بندی، کام گار طبقہ اور صنف کو بنیاد قرار دیا ہے۔ پیٹر ٹرڈجل نے اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے انگلینڈ کے نوروچ کے کمیونٹی پر تحقیق کیا۔ انہوں نے کمیونٹی کو پانچ سماجی طبقات میں تقسیم کیا: درمیانی درمیانی طبقہ (MMC)۔ نچلا درمیانی طبقہ (LMC)، اعلیٰ کام گار طبقہ (UWC)، متوسط کام گار طبقہ (MWC) اور نچلا کام گار طبقہ (LWC)۔ ان کے متغیرات (ng)، (t) اور (h) کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ singing، butter اور hammer کے تلفظ میں نچلے کام گار طبقہ سے لے کر اعلیٰ کام گار طبقہ کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ ٹرڈجل نے ان معطیات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زبان اور سماجی طبقہ بندی ایک دوسرے کو متاثر کرتی ہے۔ لہٰذا زبان کی درست تفہیم کے لیے سماجی طبقہ بندی اور تعلقات کا جائزہ لینا از حد ضروری ہو جاتا ہے۔ انہوں نے سماجی طبقہ بندی کے علاوہ صنف کو بھی لسانی تغیر اور تلفظی فرق کا وجہ قرار دیا اور یہ تصور دیا کہ عورتیں مردوں کے مقابلے زیادہ معیاری زبان استعمال کرتی ہیں۔

زبان کی آموزش کے متعلق لیسلی ملروکا نقطہ نظر:

Lesley Milroy Approach to Language Learning

زبان اور سماج کے باہمی تعلق کو سمجھنے کے لیے سماجی لسانیات میں مختلف نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں لیزلی ملروے کا ''سماجی روابط'' (Social Network) کا نظریہ ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ یہ نظریہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ زبان کے استعمال، تغیر اور تبدیلی کو سمجھنے کے لیے محض سماجی طبقے کی سمجھ کافی نہیں ہے بلکہ افراد کے باہمی تعلقات کی نوعیت اور ساخت زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لیزلی ملروے کے مطابق سماجی روابط افراد کے درمیان قائم تعلقات کا مجموعہ ہیں جو ان کی روزمرہ زندگی کو منظم کرتے ہیں۔ یہ نظریہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہر فرد ایک خاص نیٹ ورک کا حصہ ہوتا ہے اور یہی نیٹ ورک اس کے لسانی رویوں کو متاثر کرتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر زبان کو مجرد لسانی نظام کے بجائے اسے ایک سماجی عمل کے طور پر دیکھتا ہے۔

ملروے نے سماج اور سماجی روابط کو بالترتیب دو زمروں میں تقسیم کیا ہے؛ گھنا، کثیر جہتی اور مضبوط و کمزور۔ کثافت سے مراد یہ ہے کہ ایک فرد کے تعلقات کس حد تک ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر ایک نیٹ ورک کے تمام افراد آپس میں رابطے میں ہوں تو اسے گھنا نیٹ ورک کہا جائے گا۔ کثیر جہتی سے مراد یہ ہے کہ جب دو افراد کے درمیان متعدد نوعیت کے تعلقات ہوں (مثلاً رشتہ داری، ہمسائیگی، پیشہ ورانہ تعلق) تو اسے کثیر جہتی تعلق کہا جائے گا۔ مضبوط روابط میں خاندان، قریبی دوست آتے ہیں جبکہ کمزور روابط میں عام افراد، جان پہچان اور رسمی تعلقات والے افراد شمار ہوتے ہیں۔

ملروے نے یہ تصور دیا کہ گہرے اور مضبوط تعلقات میں افراد مقامی زبان یا بولی کو برقرار رکھتے ہیں۔ یہ تعلقات معیاری زبان کی تبدیلی کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔ کمزور روابط رکھنے والے افراد مختلف سماجی گروہوں سے جڑے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ نئی لسانی تبدیلیوں کو اپناتے اور پھیلاتے ہیں۔ یہی عمل زبان کی تبدیلی کا بنیادی محرک بنتا ہے۔ ملروے نے اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے بیلفاسٹ (Belfast) کے تین کام گار طبقوں پر تحقیق کیا۔ اس تحقیق کے نتیجے سے یہ بات ثابت

ہوئی کہ مضبوط تعلق رکھنے والے افراد مقامی بولی زیادہ استعمال کرتے ہیں جبکہ کمزور تعلق رکھنے والے افراد معیاری زبان استعمال کرتے ہیں۔ ملروے کا نظریہ زبان کو محض قواعدی نظام کے بجائے ایک سماجی رویہ قرار دیتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ لسانی تغیر افراد کے درمیان روابط کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔

ماحصل: مندرجہ بالا مباحث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے سماجی لسانیات کا زبان کی تدریس اور آموزش میں ایک خاص مقام ہے۔ بچوں میں زبان سیکھنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہوتی ہے۔ ان کی ابتدائی عمر کو زبان کی نشوونما اور تصورات کی آموزش کے لیے بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ کچھ بچے تعلیم کے ابتدائی مراحل میں دو یا دو سے زیادہ زبانیں روانی سے سیکھ سکتے ہیں۔ زبان کی آموزش محض قواعد، الفاظ اور تلفظ کے درست اکتساب کا نام نہیں ہے بلکہ لسانی مہارتوں اور صلاحیتوں کے عملی اظہار دراصل زبان کی آموزش ہے۔ زبان بنیادی طور پر ایک سماجی وثقافتی مظہر ہے جو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ زبان نہ صرف خیالات وجذبات کی ترسیل کا ذریعہ ہے بلکہ یہ فرد کی سماجی شناخت، تہذیبی وابستگی اور معاشرتی مقام کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔ اس لیے زبان کی تدریس اور آموزش کو سماجی تناظر میں سمجھنا ناگزیر ہے جہاں طلبہ کے سماجی پس منظر، لسانی ماحول اور ثقافتی تجربات کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

سماجی لسانیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ زبان کا استعمال مختلف سماجی عوامل کے زیر اثر تشکیل پاتا ہے۔ لسانی تغیر، تنوع اور فرق دراصل معاشرتی ساخت، طبقاتی نظام، صنفی امتیاز اور جغرافیائی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لسانی آموزش کا عمل ہر فرد کے لیے یکساں نہیں ہوتا بلکہ اس کے پس منظر کے مطابق مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ تدریسی عمل میں ان عوامل کو نظر انداز کرنا زبان کی حقیقی تفہیم میں رکاوٹ بنتا ہے جبکہ ان کو شامل کرنے سے آموزشی عمل زیادہ بامعنی اور مؤثر ہو جاتا ہے۔

سماجی تعامل کو زبان کے حصول میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ بچوں کی لسانی نشوونما ان کے اردگرد کے ماحول، باہمی روابط اور رہنمائی کے عمل سے وابستہ ہوتی ہے۔ اسی طرح معاشرتی طبقات اور سماجی روابط زبان کے انداز، ساخت اور استعمال کو متاثر کرتے ہیں جس کے نتیجے میں مختلف لسانی صورتیں جنم لیتی ہیں۔ مضبوط سماجی تعلقات مقامی بولیوں کے تحفظ کا سبب بنتے ہیں جبکہ کمزور روابط نئی لسانی تبدیلیوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس طرح زبان ایک متحرک اور تغیر پذیر عمل کے طور پر سامنے آتی ہے جو معاشرتی حرکیات کے ساتھ مسلسل تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

تعلیم کے میدان میں اس امر کی ضرورت ہے کہ زبان کی تدریس کو سماجی وثقافتی سیاق وسباق سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اساتذہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ طلبہ کی لسانی اور سماجی خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے تدریسی حکمت عملی اختیار کریں تاکہ زبان نہ صرف سیکھنے کا ذریعہ بنے بلکہ فہم، اظہار اور سماجی ہم آہنگی کا مؤثر وسیلہ بھی بنے۔ اس نقطۂ نظر کے ذریعے زبان کی تعلیم کو زیادہ مربوط، بامقصد اور عملی زندگی سے قریب تر بنایا جاسکتا ہے جو ایک متوازن اور مؤثر تعلیمی عمل کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ماہرینِ تعلیم، لسانیات، نفسیات اور سماجیات نے بچوں میں زبان کی نشوونما اور ان کے ذہن ودماغ پر معاشرتی اثرات کی وضاحت کے لیے مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ ان نظریات کو بروئے کار لاکر استاد اور طلبہ کے درمیان ایک بہترین تعلق قائم کیا جاسکتا ہے اور آموزشی ماحول کو مؤثر اور پرلطف بنایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ زبان کے استاد کو زبان پر مرتب ہونے والے معاشرتی اثرات کو بھی سمجھنا لازمی ہے تاکہ زبان کے تدریسی عمل کو نتیجہ خیز اور بامعنی بنایا جاسکے۔

حوالہ جات:

Holmes, J. (2013). An Introduction to Sociolinguistics. New York: Routledge 2 Park Square, Milton Park, Abingdon, Oxon OX14 4RN 711 Third Avenue.

Trudgill, P. (2000). Sociolinguistics: An Introduction to Language and Society (4th Ed). England: Penguin Books Ltd, 80 Strand, London.

Wardhaugh, R. (2006). An Introduction to Sociolinguistics. USA: 350 Main Street, Malden, MA 02148-5020.

Yasemin Bayyurt, Y. (2013). Current Perspectives on Sociolinguistics and English Language Education. The Journal of Language Teaching and Learning, Vol. 1, pp. 69-78

Hornberger, N, H. and McKay, S, L. (2010). Sociolinguistics and Language Education. UK: Short Run Press Ltd.

Coupland, N. and Jaworski, A. (1997). Sociolinguistics: A Reader. New York: St. Martin's Press, Scholarly and Reference Division, 175 Fifth Avenue.

Ferguson, C, A. (1996). Sociolinguistic Perspectives: Papers on Language in Society, 1959-1994. New York: Oxford University Press.

☆☆☆

Tarannum Reyaz ke Novel "Barf Aashna Parinde" ka Tanqidi-o-Tahqeeqi Mutalea by Tahir Ahmad Mir (Research Scholar, Dept. of Urdu Devi AhilyaVishwavidyalaya, Indore) cell-9541649454

طاہر احمد میر (ریسرچ اسکالر، شعبہ، اردو دیوی اہلیہ وشوودھیالیہ، اندور)

ترنم ریاض کے ناول برف آشنا نہ پرندے کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ

اکیسویں صدی کے اردو ناول نے موضوع، اسلوب، فکری جہات اور تہذیبی شعور کے اعتبار سے غیر معمولی وسعت حاصل کی ہے۔ اس دور کا ناول محض قصہ گوئی یا واقعاتی ترتیب کا نام نہیں رہا، بلکہ یہ انسانی وجود، اجتماعی حافظے، سیاسی جبر، تہذیبی بحران، نسائی شعور، داخلی کرب اور بدلتی ہوئی سماجی ساختوں کے پیچیدہ تعامل کا فنی اظہار بن چکا ہے۔ معاصر اردو ناول نگاروں میں ترنم ریاض ایک اہم اور ممتاز نام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا ناول برف آشنا پرندے 2009 میں شائع ہوا، اور یہ ان کی نمایاں تخلیقات میں شمار ہوتا ہے۔ ریختہ کے کتابی اندراج کے مطابق اس ناول کی مصنفہ ترنم ریاض ہیں، اس کا ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ہے، اور سنِ اشاعت 2009 ہے۔ اس ناول کو ترنم ریاض کی مجموعی ادبی شناخت کے تناظر میں بھی دیکھا جاتا ہے، جہاں برف آشنا پرندے ان کی اہم کتب میں شامل ہے۔

ترنم ریاض کا ادبی مقام اس اعتبار سے خصوصی اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے اردو فکشن میں خصوصاً کشمیر، عورت، شناخت، تہذیبی بے دخلی، خوف، یادداشت اور انسانی المیے کو نہایت داخلی اور جمالیاتی سطح پر برتا ہے۔ ان کا تخلیقی سرمایہ محض واقعات کے بیان تک محدود نہیں، بلکہ وہ زندگی کے ان گوشوں کو آواز دیتی ہیں جو اکثر رسمی بیانیوں میں نظر انداز

ہو جاتے ہیں۔ برف آشنا پرندے اسی تخلیقی شعور کا نمائندہ ناول ہے۔ یہ ناول ایک ایسے اجتماعی اور انفرادی تجربے کو متن میں ڈھالتا ہے جو بیک وقت جغرافیائی بھی ہے، تہذیبی بھی، نفسیاتی بھی اور تاریخی بھی۔ اس میں کشمیر کا مسئلہ محض سیاسی قضیہ نہیں رہتا بلکہ انسانی رشتوں، اجتماعی حافظے، ثقافتی شناخت اور وجودی عدم تحفظ کے بڑے سوالات کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس ناول کو صرف ایک علاقائی یا نسائی ناول کہہ کر محدود نہیں کیا جا سکتا؛ یہ اکیسویں صدی کے اردو ناول کی فکری وسعت اور فنی پختگی کی ایک معتبر مثال ہے۔ اس ناول کا پہلا قابلِ توجہ وصف اس کا تہذیبی پس منظر ہے۔ برف آشنا پرندے میں کشمیر ایک پس منظر یا منظر نامہ نہیں، بلکہ ایک زندہ، متحرک اور زخمی تہذیبی وجود کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ترنم ریاض چونکہ خود کشمیری تہذیب، تاریخ اور معاشرتی تجربے سے گہری واقفیت رکھتی ہیں، اس لیے ان کے یہاں کشمیر کی تصویر سطحی مشاہدے یا بیرونی تعارف کی بنیاد پر نہیں بنتی، بلکہ ایک اندرونی تجربے، ایک تہذیبی وابستگی اور ایک جذباتی صداقت کے ساتھ ابھرتی ہے۔ ناول میں برف، موسم، خاموشی، نقل مکانی، خوف زدہ فضا اور یادداشت کی لہریں مل کر ایک ایسی دنیا تشکیل دیتی ہیں جس میں حسن اور کرب کی ہم آہنگی موجود ہے۔ کشمیر کی اسی تہذیبی اور جذباتی بازیافت کے سبب بعض تنقیدی تحریروں میں برف آشنا پرندے کو ''کشمیری ثقافت کا رزمیہ'' اور ''زرافشاں تخیل کا ترجمان'' قرار دیا گیا ہے۔

اکیسویں صدی کے اردو ناول میں شناخت کا مسئلہ ایک بنیادی فکری مسئلے کے طور پر سامنے آیا ہے، اور برف آشنا پرندے اس تناظر میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس ناول کے کردار محض فرد نہیں بلکہ تاریخ کے بوجھ، سیاست کے جبر، تہذیب کے زوال اور اجتماعی بے یقینی کے نمائندہ وجود بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی شناخت کسی ایک دائرے میں منجمد نہیں، بلکہ وہ اپنی زمین، زبان، ثقافت، ماضی اور حال کے درمیان پھیلی ہوئی کشمکش میں تشکیل پاتی ہے۔ یہ کشمکش بعض اوقات خاموش اضطراب کی صورت اختیار

کرتی ہے، بعض اوقات تعلقات کے انتشار میں ظاہر ہوتی ہے، اور بعض مواقع پر داخلی مزاحمت یا جذباتی تھکن میں ڈھل جاتی ہے۔ ترنم ریاض اس شناختی بحران کو خطی یا نظریاتی انداز میں نہیں بلکہ زندگی کے جیتے جاگتے تجربے کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ اسی لیے ناول کا مطالعہ ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ شناخت محض ایک سماجی یا سیاسی مسئلہ نہیں، بلکہ یہ جذبات، یادداشت، زبان، مقام اور تعلق کے باہمی رشتوں سے وجود میں آنے والی ایک پیچیدہ داخلی کیفیت بھی ہے۔

برف آشنا پرندے کی ایک بڑی فنی قوت اس کی زبان ہے۔ ترنم ریاض کی نثر نہایت لطیف، رواں، شعری اور تہہ دار ہے۔ ان کے یہاں زبان محض بیانیہ وسیلہ نہیں بلکہ تخلیقی تجربے کی اصل روح ہے۔ وہ الفاظ کو اس طرح برتتی ہیں کہ ان میں منظر بھی پیدا ہوتا ہے، کیفیت بھی، علامت بھی اور تہذیبی حوالہ بھی۔ ان کی نثر کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شعریت موجود ہونے کے باوجود ابہام یا تصنع پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بیانیے کو ایسی لسانی گرفت میں رکھتی ہیں کہ قاری ایک طرف معنوی گہرائی محسوس کرتا ہے اور دوسری طرف متن کی روانی برقرار رہتی ہے۔ برف آشنا پرندے میں برف، پرندے، خاموشی، گھر، وادی، اجنبیت اور یاد جیسے الفاظ محض لغوی اکائیاں نہیں رہتے بلکہ پورے ناول میں ایک علامتی نظام تشکیل دیتے ہیں۔ یہی علامتی اور جمالیاتی درجہ بندی ناول کو عام بیانیہ نثر سے ممتاز کرتی ہے اور اسے ایک بلند ادبی مقام عطا کرتی ہے۔

اس ناول کے اسلوب پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ترنم ریاض نے روایت اور جدیدیت کے امتزاج سے ایک نہایت متوازن بیانیہ قائم کیا ہے۔ ان کے یہاں قصے کی لڑی موجود ہے، مگر وہ صرف واقعاتی ترتیب پر انحصار نہیں کرتیں۔ کرداروں کی نفسیاتی کیفیت، ماحول کی معنویت، ماضی کی بازگشت، حال کی شکستگی اور زبان کی علامتی وسعت مل کر اسلوب کو تہہ دار بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برف آشنا پرندے نہ صرف قصہ سناتا ہے بلکہ احساس، فضا، یادداشت اور تاریخ کو بھی ساتھ ساتھ متن میں جذب کرتا چلتا

ہے۔ ایک تنقیدی مکالمے میں برف آشنا پرندے کو ان اہم ہندوستانی اردو ناولوں میں شمار کیا گیا ہے جن میں ''کلچرل ڈسکورس''، ''نفسیاتی دروں بینی'' اور زندگی کی حیرت انگیز پیچیدگیوں کا تخلیقی انکشاف ملتا ہے۔ اس تناظر میں یہ ناول محض موضوعاتی اہمیت کا حامل نہیں بلکہ اسلوبیاتی اور فنی اعتبار سے بھی معاصر اردو ناول کا ایک نمائندہ متن ہے۔

ناول میں یادداشت کا عنصر خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ اکیسویں صدی کا انسان ماضی سے کٹا ہوا بھی ہے اور اسی کے بوجھ تلے دبا ہوا بھی۔ برف آشنا پرندے میں یہی یادداشت نہ صرف ایک شخصی تجربہ ہے بلکہ اجتماعی زندگی کی تشکیل میں بھی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ کرداروں کے لیے ماضی کوئی مردہ باب نہیں بلکہ ایک متحرک اور متأثر کن حقیقت ہے جو ان کے حال میں مسلسل مداخلت کرتی ہے۔ ترنم ریاض نے ماضی کو محض نوستالجیا یا رومانوی رجعت کے طور پر پیش نہیں کیا، بلکہ اسے ایک ایسے تجربے کے طور پر برتا ہے جس کے بغیر حال کی معنویت مکمل نہیں ہوتی۔ اس طرح ناول میں یادداشت ایک فنی آلہ بھی بن جاتی ہے اور ایک فکری استعارہ بھی۔ یہ یادداشت فرد کو اس کی تہذیبی جڑوں سے جوڑتی بھی ہے اور اس کے زخموں کو تازہ بھی رکھتی ہے۔ یہی دوہرا عمل ناول کی داخلی کشش اور معنوی کثافت میں اضافہ کرتا ہے۔

ترنم ریاض کے ناول میں عورت کا تجربہ بھی مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ برف آشنا پرندے کو محض نسائی ناول قرار دینا اس کی معنوی وسعت کو محدود کر دے گا، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ناول میں عورت کا وجود نہایت حساس، باریک اور باوقار انداز میں سامنے آتا ہے۔ عورت یہاں محض مظلوم یا حاشیائی کردار نہیں بلکہ احساس، برداشت، یادداشت، محبت، تہذیبی تسلسل اور داخلی استقامت کی علامت بھی بن جاتی ہے۔ ترنم ریاض عورت کے باطن کو نہایت وقار اور فنکارانہ گہرائی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ وہ اس کے تجربے کو نہ جذباتی مبالغے میں تبدیل کرتی ہیں اور نہ اعلانیہ نظریاتی نعروں میں۔ اس کے برعکس، وہ عورت کی خاموشی، کرب، نفسیاتی انتشار، محبت،

خوف اور حوصلے کو ایک ایسی ادبی زبان دیتی ہیں جو قاری کو متاثر بھی کرتی ہے اور سوچنے پر بھی آمادہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نسائی شعور احتجاج سے زیادہ داخلی بصیرت اور انسانی وقار کا شعور معلوم ہوتا ہے۔

ناول کے پلاٹ کے اعتبار سے برف آشنا پرندے ایک ایسا ناول ہے جس میں واقعات کی ظاہری ترتیب سے زیادہ ان کے نفسیاتی، تہذیبی اور انسانی اثرات کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس کا پلاٹ محض کسی ایک واقعے یا حادثے کے گرد نہیں گھومتا، بلکہ کشمیری معاشرت، خوف زدہ فضا، یادداشت، نقل مکانی، داخلی کرب اور رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کے باہمی امتزاج سے تشکیل پاتا ہے۔ ترنم ریاض نے پلاٹ کو سنسنی یا محض قصہ گوئی کا ذریعہ نہیں بنایا، بلکہ اسے ایک ایسے وسیلے کے طور پر برتا ہے جس کے ذریعے ایک پورے عہد کی بے چینی، تہذیبی زخم اور انسانی بے بسی سامنے آتی ہے۔ ناول کا پلاٹ بظاہر سادہ مگر اپنے باطن میں نہایت گہرا، علامتی اور تہہ دار ہے، جس میں ماضی اور حال ایک دوسرے سے جڑ کر زندگی کی پیچیدہ معنویت کو آشکار کرتے ہیں۔

کردار نگاری کے اعتبار سے بھی برف آشنا پرندے ایک اہم ناول ہے، کیونکہ اس کے کردار محض کہانی کو آگے بڑھانے والے افراد نہیں بلکہ اپنے عہد، اپنے ماحول اور اپنی داخلی کشمکش کے نمائندہ ہیں۔ ترنم ریاض نے کرداروں کو بڑی نفسیاتی باریکی، تہذیبی حساسیت اور انسانی سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خاص طور پر نسائی کردار نہایت وقار، خاموش استقامت اور داخلی گہرائی کے ساتھ سامنے آتے ہیں، جب کہ دوسرے کردار بھی خوف، بے یقینی، محرومی اور شناختی بحران کے مختلف تجربات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کے کردار یک رخے یا رسمی محسوس نہیں ہوتے، بلکہ ایک زندہ اور باطن رکھنے والے انسانوں کی صورت میں قاری کے سامنے آتے ہیں۔ اس طرح کردار نگاری ناول کی فنی مضبوطی اور معنوی تاثیر میں نمایاں اضافہ کرتی ہے۔

برف آشنا پرندے میں منظر نگاری کا فنی استعمال بھی غیر معمولی ہے۔ ترنم ریاض

فطرت کو صرف منظر کی آرائش کے لیے استعمال نہیں کرتیں، بلکہ وہ اسے کرداروں کے اندرونی احساسات اور پورے عہد کے معنوی تناظر سے جوڑ دیتی ہیں۔ برف یہاں سردی یا موسم کا بیان نہیں بلکہ سکوت، جمود، اندیشے، کرب اور منجمد ہوتے ہوئے وقت کی علامت بن جاتی ہے۔ اسی طرح پرندے محض فطری موجودات نہیں بلکہ آزادی، بے گھری، نقل مکانی، نازک حیات اور امکان کے استعارے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ناول کا عنوان خود اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ مصنفہ نے علامت کو اپنے بیانیے کا بنیادی جزو بنایا ہے۔ عنوان، فضا، زبان اور منظر کے درمیان یہ باہمی ربط ناول کے فنی حسن میں اضافہ کرتا ہے اور اس کی قرأت کو کئی معنوی سطحوں تک پھیلا دیتا ہے۔

اکیسویں صدی کے اردو ناول میں جو رجحان حقیقت، تخیل، تاریخ، نفسیات اور ثقافت کے باہمی امتزاج کی صورت میں سامنے آیا ہے، برف آشنا پرندے اسی رجحان کی ایک نمایاں مثال ہے۔ یہ ناول نہ خالص سیاسی بیانیہ ہے، نہ صرف نفسیاتی تجزیہ، نہ فقط تہذیبی مرثیہ، اور نہ محض عورت کے دکھ کی داستان؛ بلکہ یہ ان تمام جہات کو ایک مربوط تخلیقی وحدت میں سمو دیتا ہے۔ اسی لیے اس ناول کو ایک سے زیادہ زاویوں سے پڑھا جا سکتا ہے۔ ایک قاری اسے انسانی المیے اور رشتوں کے انتشار کی داستان کے طور پر پڑھے گا، دوسرا اسے کشمیری تہذیب کی بازیافت سمجھے گا، تیسرا اسے نسائی شعور کی تخلیقی پیش کش مانے گا، اور چوتھا اسے معاصر اردو ناول کے اسلوبیاتی ارتقا کے ایک اہم سنگ میل کے طور پر دیکھے گا۔ یہی کثیر الجہتی اس ناول کی اصل قوت ہے۔

تنقیدی سطح پر برف آشنا پرندے کی اہمیت اس لیے بھی نمایاں ہے کہ یہ اردو ناول کو نئے جغرافیوں، نئے داخلی تجربوں اور نئے تہذیبی سوالات سے ہم کنار کرتا ہے۔ معاصر اردو تنقید میں ترنم ریاض کے اس ناول کو ان اہم ناولوں میں شامل کیا گیا ہے جنہوں نے اردو ناول کے فکری اور جمالیاتی افق کو وسیع کیا۔ اس ناول میں فرد اور تاریخ کا تعلق، تہذیب اور سیاست کی کشمکش، عورت اور معاشرے کا رشتہ، اور یادداشت و

شناخت کی باہمی تشکیل اس طرح سامنے آتی ہے کہ متن محض ادبی تخلیق نہیں رہتا بلکہ ایک زندہ تہذیبی اور انسانی دستاویز میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برف آشنا پرندے کو اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔

نتیجتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترنم ریاض کا ناول برف آشنا پرندے اکیسویں صدی کے اردو ناول کی فکری وسعت، لسانی توانائی، تہذیبی حساسیت اور اسلوبیاتی بلوغت کا ایک روشن نمونہ ہے۔ یہ ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے کشمیر، شناخت، عورت، یادداشت اور انسانی المیے کے بڑے سوالات سے وابستہ ہے، اور اپنی فنی ساخت کے اعتبار سے علامتی گہرائی، شعری نثر، نفسیاتی دروں بینی اور تہذیبی بازیافت کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ اس کی اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ یہ اپنے عہد کے کرب کو محض بیان نہیں کرتا بلکہ اسے ایک ایسے ادبی تجربے میں بدل دیتا ہے جو قاری کے شعور میں دیر تک زندہ رہتا ہے۔ برف آشنا پرندے نہ صرف ترنم ریاض کی تخلیقی بصیرت کا ثبوت ہے بلکہ معاصر اردو ناول کی اُس سمت کا بھی اشاریہ ہے جہاں ادب زندگی کے پیچیدہ ترین تجربات کو فنی وقار، فکری گہرائی اور تہذیبی سچائی کے ساتھ محفوظ کرتا ہے۔ اسی بنا پر یہ ناول تحقیقی مطالعے، علمی مباحث اور اشاعتی سطح کے ادبی تجزیے کے لیے نہایت موزوں اور اہم متن کی حیثیت رکھتا ہے۔

☆☆☆